www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

June 2014 • No. 451 • Rs. 15

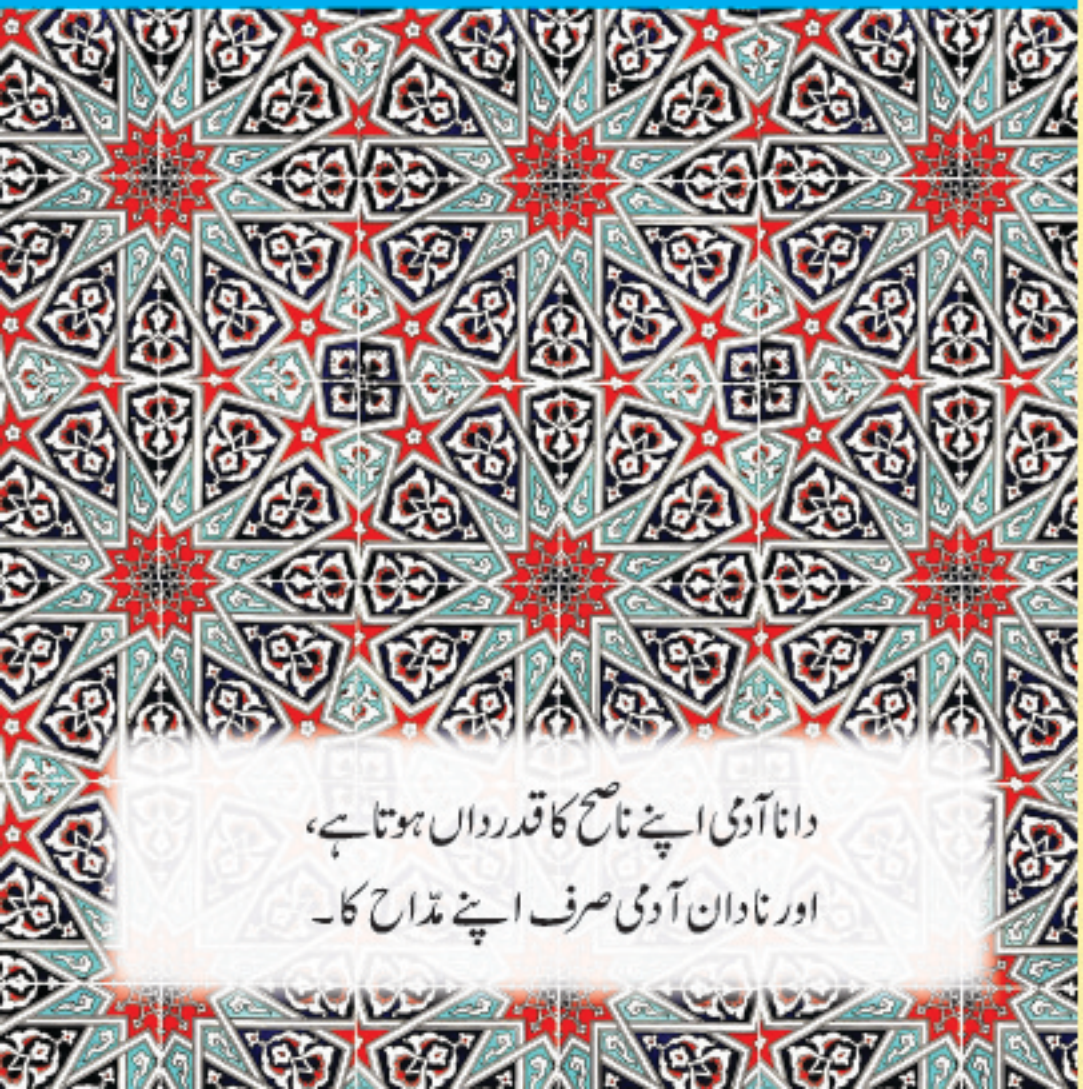

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الرسالہ

جون 2014

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

فہرست

سیئات، حسنات	2
لائف سپورٹ سسٹم	3
توبۂ نصوح	4
آزادی کا غلط استعمال	6
انجامِ آخرت	7
متشابہ جنت، حقیقی جنت	8
زمین کی حفاظت	9
نقل وحرکت	10
انسان، ٹکنالوجی	12
حقیقت پسندانہ مزاج	13
سب کچھ خدا کا عطیہ	16
قرآن کا پیغام	18
کائنات کا سائنسی مطالعہ	22
مسلم تاریخ کا احیا	23
مردوزن کی مساوات	24
تخلیق انسانی کا مقصد	25
دہشت گردی کا مسئلہ	32
ردِّعمل کی سیاست	35
پیغمبرانہ ماڈل	38
شخصیت کی پہچان	39
اپنی تاریخ سے کٹنا	40
انتخابِ اول، انتخابِ ثانی	43
ترقی کا زینہ	44
فخر اور نفرت	45

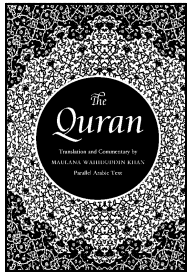

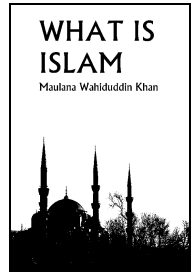

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-41827083, 46521511,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹20
One year ₹200
Two years ₹400
Three years ₹600
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

سیئات، حسنات

قرآن کی سورہ الفرقان میں ایک قانونِ فطرت کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا (25:70) یعنی مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

God will change the evil deeds of such people into good ones.

قرآن کی اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ اللہ اُن کے سیئات کو معاف کر دے گا۔ اِس کے برعکس، یہ فرمایا کہ اللہ اُن کے سیئات کو بدل کر اُن کو حسنات میں تبدیل کر دے گا۔ یہ ایک بے حد قابلِ غور بات ہے کہ ایسا کیوں کر ہوتا ہے کہ خود سیئات بدل کر حسنات بن جائیں۔

قرآن کی اِس آیت میں دراصل ایک نفسیاتی قانون کو بتایا گیا ہے۔ انسان جب ایک غلطی کرے اور اس کے بعد اس کے اندر شدت کے ساتھ یہ احساس جاگ اٹھے کہ میں نے ایک غلطی کر دی، تو یہ کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ اِس کے بعد اس کے اندر فطری طور پر شرمندگی (repentance) کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ احساس اُس کے لیے ایک ذہنی بھونچال کا کام کرتا ہے۔ اِس کے بعد شدت کے ساتھ اس کے اندر محاسبہ (introspection) کی سوچ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ شدید طور پر اپنی اصلاح کے لیے متحرک ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک نئے قسم کی ذہنی بیداری (intellectual awakening) پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ذہنی بیداری اس کی پوری شخصیت میں ایک مثبت انقلاب کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنی اصلاح کے کام میں مشغول ہو جاتا ہے، اِس طرح اس کے اندر ایک نئی شخصیت ایمرج (emerge) کرتی ہے۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ جس آدمی کی فطرت زندہ ہو، اُس کا وہی حال ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ غلطی کا احساس اُس کے اندر ایک نیا پراسس جاری کر دیتا ہے۔ یہ اِسی فطری پراسس کی تکمیل ہے جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

لائف سپورٹ سسٹم

قرآن کی سورہ الاعراف کی ایک آیت یہ ہے: وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (7:10) یعنی ہم نے تم کو زمین میں جگہ دی اور ہم نے تمھارے لیے اس میں زندگی کا سامان فراہم کیا، مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

'معایش' کا لفظ 'معیشة' کی جمع ہے۔ قرآن کی اِس آیت میں معایش سے مراد اسبابِ معیشت ہیں، یعنی کھانا اور پینا اور دوسری وہ تمام چیزیں جن پر انسانی زندگی کا مدار ہو۔ مفسر القرطبی نے معایش کی وضاحت اِن الفاظ میں کی ہے: مایُتعیَّش به من الطعم والمشرب وماتكون به الحياة (تفسير القرطبي: 7/167)

اسباب معیشت سے مراد وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ ایسے اسباب جو انسان جیسی مخلوق کی بقا کے لیے ضروری ہیں، وہ صرف سیارہ زمین پر پائے جاتے ہیں۔ وسیع کائنات میں کسی دوسرے مقام پر یہ اسبابِ حیات موجود نہیں۔

لائف سپورٹ سسٹم انسان کے لیے ایک استثنائی عطیہ ہے، ایسا عطیہ جو ساری کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔ لائف سپورٹ سسٹم میں بے شمار آئٹم ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی آئٹم انسان خود سے پیدا نہیں کرسکتا۔ یہ پورا نظام اللہ کی طرف سے انسان کے لیے یک طرفہ عطیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عطیہ اپنے آپ اِس بات کا ثبوت ہے کہ انسان سے اس کے بارے میں یقیناً سوال کیا جائے کہ اس نے اِس عطیے کا حق ادا کیا یا نہیں۔

یہی مطلب ہے قرآن کی اِس آیت کا: ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (102:8) یعنی پھر اُس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں یقیناً پوچھا جائے گا:

Then on the Day you shall be questioned about the favours.

توبۂ نصوح

قرآن کی سورہ التحریم میں اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ اللہ سے توبہ نصوح کرو اور توبہ نصوح تمھارے لیے جنت میں داخلے کا سبب بنے گی (66:8)۔ توبۂ نصوح سے مراد مخلصانہ توبہ (sincere repentance) ہے۔ توبہ نصوح کیا ہے، اس کو قرآن کی سورہ النساء کی دو آیتوں کے مطالعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ آیتیں یہ ہیں: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۗ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (4:17-18)۔

قرآن کی اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کی دو قسمیں ہیں — ایک، مقبول توبہ اور دوسری، غیر مقبول توبہ۔ مقبول توبہ وہ ہے جو حقیقی احساسِ خطا کے بعد پیدا ہوا اور جو ایک ایسے نئے اور پُرعزم فیصلے کے ہم معنی ہو جس کو آدمی نے اپنے دل و دماغ کی پوری طاقت کے ساتھ کیا ہو۔ اِس کے برعکس، غیر مقبول توبہ وہ ہے جو کسی حقیقی فیصلے کے ہم معنی نہ ہو، بلکہ اس کی حیثیت صرف لِپ سروس (lip service) کی ہو۔

توبۂ نصوح کیا ہے، اس کی مزید وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن الله يقبل توبة العبد مالم يغرغر (سنن الترمذي، رقم الحديث: 3537) یعنی اللہ غرغرہ پیش آنے تک بندے کی توبہ قبول کرتا ہے۔

جب موت کا وقت قریب آتا ہے اور انسان محسوس کرتا ہے کہ اب اس کے لیے زندگی کی مزید مہلت باقی نہیں رہی، اُس وقت ایک صاحبِ فکر انسان کے اندر زبردست بھونچال آجاتا ہے۔ اس کی وہ حالت ہو جاتی ہے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں برین اسٹارمنگ (brain storming) کہا جاتا

ہے۔اُس وقت اس کو شدید طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر ضائع کردی۔اس کو اپنا مستقبل بالکل تاریک دکھائی دینے لگتا ہے۔کسی انسان پر اگر یہ زلزلہ خیز حالت طاری ہوجائے تو ایک لمحے کے اندر اس کو توبہ نصوح کی توفیق حاصل ہوجائے گی۔اس کے گناہ اس کے اعمال نامے سے اچانک ڈلیٹ (delete) ہوجائیں گے۔

یہی وہ حالت ہے جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: التائب من الذنب کمن لا ذنب له (الجامع الصغير للسيوطي، رقم الحديث: 3387) یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ اس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا تھا۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مومن حقیقی توبہ کرے تو اللہ تعالی عین اُسی وقت اس کے گناہوں کو اس کے اعمال نامے سے حذف کردے گا۔ایک گناہ گار شخصیت اچانک ایک بے خطا شخصیت کی صورت اختیار کرلے گی۔

توبہ کا معاملہ سادہ معنوں میں صرف خطا اور عفوِ خطا کا معاملہ نہیں ہے، اس کی اہمیت اس سے زیادہ ہے۔توبہ ایک نفسیاتی عمل (psychological process) ہے، جس کے ذریعے ایک انسان کو موقع ملتا ہے کہ وہ مسلسل اپنی شخصیت کی تعمیر جاری رکھے، یہاں تک کہ وہ پورے معنوں میں مزکی شخصیت (purified personality) بن جائے۔

انسان کو سب سے زیادہ جو چیز جھنجھوڑتی ہے، وہ خطا کاری کا احساس ہے، نہ کہ معصومیت کا احساس۔ معصومیت کے احساس سے آدمی کے اندر ٹھہراؤ آتا ہے، جب کہ خطاری کا احساس آدمی کے اندر ایک ذہنی بھونچال پیدا کردیتا ہے۔یہی وہ بھونچال ہے جو آدمی کے اندر چھپے ہوئے پوٹنشیل (potential) کو جگاتا ہے۔وہ شدت کے ساتھ آدمی کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا کردیتا ہے۔اِس لیے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کو ایسا انسان پسند ہے جو غلطی کرے اور معافی مانگے (خير الخطائين التوابون)۔کسی شخص کے اندر اِس نفسیاتی اصلاح کے جاری ہونے ہی کا شرعی نام توبہ نصوح ہے۔توبہ نصوح اپنی حقیقت کے اعتبار سے محض کچھ الفاظ کی ادائیگی کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک نفسیاتی بھونچال کا نام ہے۔ایک ایسا نفسیاتی بھونچال کہ جب وہ کسی انسان کے اندر آتا ہے تو اس کی پوری شخصیت کو بدل دیتا ہے۔

آزادی کا غلط استعمال

قرآن کی ایک آیت یہ ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (30:41) یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے، تاکہ اللہ اُن کو مزا چکھائے اُن کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔

دنیا میں جو فساد یا کرپشن (corruption) پایا جاتا ہے، وہ تخلیق کا حصہ نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کی آزادی کے غلط استعمال (misuse of freedom) کا حصہ ہے۔ موجودہ زمانے میں فضائی آلودگی (air pollution) اور آبی آلودگی (water pollution) کا مسئلہ اپنی آخری حد تک بڑھ گیا ہے۔ یہ آلودگی تخلیق کے آغاز میں موجود نہ تھی، حتی کہ جدید صنعتی انقلاب سے پہلے وہ بہت کم پائی جاتی تھی۔ مگر جدید صنعتی انقلاب کے بعد آلودگی کا مسئلہ انتہائی خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے۔

تاکہ اللہ ان کو مزا چکھائے اُن کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں — اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فساد کی صورت میں جو مسئلہ اِس دنیا میں پیش آتا ہے، اُس کی حیثیت ایک شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) کی ہے۔ وہ اِس لیے ہے تاکہ انسان سوچے، تاکہ انسان مصنوعاتِ خداوندی اور مصنوعاتِ انسانی کا تقابل کرکے یہ دریافت کرے کہ اللہ کی قدرت کتنی زیادہ ہے اور اس کے مقابلے میں انسان کا عجز کتنا زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اللہ کی مصنوعات میں کہیں کوئی نقص (67:3) نہیں، جب کہ انسان کی مصنوعات نقائص سے بھری ہوئی ہیں۔

یہ دریافت ایمان باللہ کا دروازہ ہے۔ آدمی جتنا زیادہ اِس حقیقت کو دریافت کرے گا، اتنا ہی زیادہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کرے گا۔ عجزِ انسانی کی دریافت معرفتِ الٰہی کی دریافت کا آغاز ہے۔ جو انسان عجز کی دریافت سے محروم رہے، وہ معرفتِ الٰہی کی دریافت سے بھی محروم رہے گا۔ عجز کے سوا کوئی دروازہ نہیں جس کے ذریعے آدمی معرفت کی دنیا میں داخل ہو سکے۔

انجامِ آخرت

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن الرجل ليعمل عمل أهل الجنة فيما يبدو للناس، وهو من أهل النار - وإن الرجل ليعمل عمل أهل النار فيما يبدو للناس، وهو من أهل الجنة (صحيح البخاري، رقم الحديث: 4202) یعنی ایک آدمی لوگوں کے خیال کے مطابق، اہلِ جنت کا عمل کرتا ہے، حالاں کہ وہ جہنم والوں میں سے ہوتا ہے۔ اور ایک آدمی لوگوں کے خیال کے مطابق، اہلِ جہنم کا عمل کرتا ہے، حالاں کہ وہ جنت والوں میں سے ہوتا ہے۔

اِس حدیث میں فیما یبدو للناس کا لفظ بہت اہم ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص بظاہر (face vlue) پر کچھ اور ہوتا ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے، وہ کچھ اور ہوتا ہے۔ یہاں 'فیما یبدو للناس' کے مقابلے میں، 'فیما یبدو للہ' کا لفظ محذوف ہے۔ دنیا کی زندگی میں 'فیما یبدو للناس' کے اعتبار سے، آدمی بظاہر کچھ اور دکھائی دے سکتا ہے، لیکن آخرت میں اس کا معاملہ 'فیما یبدو للہ' کے اعتبار سے ہوگا۔ یہ بات صالح انسان کی نسبت سے بھی ہے اور غیر صالح انسان کی نسبت سے بھی۔

تاہم یہ معاملہ دنیا کی زندگی میں بھی کسی نہ کسی موقع پر کھل جاتا ہے۔ دونوں قسم کے انسانوں کی زندگی میں آخر کار کوئی ایسا شاکنگ واقعہ (shocking event) پیش آتا ہے جس کے بعد اندر کی شخصیت کھل کر باہر آجاتی ہے۔ یہ اللہ کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ مثلاً قدیم مکہ میں حمزہ بن عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے تھے، مگر ایک واقعے نے ان کو ہلا دیا اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ: ديني دين محمد (میرا دین وہی ہے جو محمد کا دین ہے)۔ اِسی طرح قدیم مدینہ میں ایک شخص عبد اللہ بن اُبی تھا۔ وہ بظاہر کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گیا تھا، لیکن مدینہ میں ایک واقعہ پیش آیا جس کے بعد اس کا داخلی نفاق نمایاں ہوگا اور وہ اسلام سے خارج قرار پایا۔ یہ واقعہ ہر انسان کے ساتھ پیش آتا ہے، کسی بھی انسان کا اِس معاملے میں کوئی استثنا (exception) نہیں۔

متشابہ جنت، حقیقی جنت

قرآن کی سورہ محمد میں اہلِ جنت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ آیت آئی ہے: وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (47: 6) یعنی اللہ اہلِ ایمان کو جنت میں داخل کرے گا۔ اللہ نے اُن کو اِس جنت کی پہچان کرادی ہے۔

اِس آیت میں پہچان سے کیا مراد ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت اور جنت کے بارے میں بہت زیادہ سوچتا ہے، وہ جنت کے بارے میں کچھ ایسے سراغ (clues) پالیتا ہے جس کے حوالے سے وہ جنت کے بارے میں خصوصی دعا کرے اور آخر کار وہ اللہ کے نزدیک جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے۔ جنت کی اِس پہچان کا تعلق موجودہ دنیا سے ہے، نہ کہ آخرت کی دنیا سے۔

مثلاً اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہونے کے بعد جنت کی نعمتوں کا تجربہ کریں گے تو اُن کا جو حال ہوگا، اُس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (2: 25) یعنی جب بھی اہل جنت کو جنت کے باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اِس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا، اور ملے گا اُن کو ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو جنت کے متشابہ (similar) بنایا ہے۔ جب ایک مومن غور وفکر کرتا ہے تو وہ اِس حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے کہ موجودہ دنیا، جہاں خدا نے اس کو رہنے کا موقع دیا ہے، وہ جنت کے مشابہ دنیا ہے۔

یہ دریافت بندۂ مومن کے اندر ایک قسم کا اہتزاز (thrill) پیدا کرتی ہے۔ وہ شکر کے احساس کے تحت کہہ اٹھتا ہے کہ — خدایا، تو نے موت سے پہلے کی زندگی میں مجھ کو متشابہ جنت عطا کر دی، اب تو موت کے بعد کی زندگی میں مجھ کو حقیقی جنت میں داخل فرما دے۔

زمین کی حفاظت

موجودہ زمانے میں جو آلات دریافت ہوئے ہیں، ان کے ذریعے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ خلائی واقعات کا نہایت صحت کے ساتھ مشاہدہ کیا جاسکے۔ اُنھیں میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ 23 جولائی 2012 کو سورج کی سطح پر ایک مقناطیسی طوفان آیا تھا۔ یہ طوفان زمین کے اوپر بہت بڑی تباہی (havoc) برپا کرسکتا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیوں کہ یہ طوفان سورج کی ایک سمت میں آیا تھا، جب کہ زمین اپنی گردش کے اعتبار سے اُس وقت سورج کے دوسری سمت میں تھی۔ اس طرح کے واقعات ہماری دنیا میں روزانہ پیش آرہے ہیں۔ یہ واقعات قرآن کی اُس آیت کی تفسیر ہیں جس میں کہا گیا ہے: قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۭ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (21:42)۔

کائنات میں انسان کی حفاظت کا یہ انتظام بتاتا ہے کہ اللہ کتنے زیادہ بڑے پیمانے پر انسان کے ساتھ رحمت کا معاملہ کررہا ہے۔ انسان اپنی غفلت کی بنا پر اِس حقیقت سے بے خبر رہتا ہے۔ اگر انسان اِس حقیقت کو جانے تو بلاشبہہ اس کی زندگی میں ایک ربانی انقلاب آجائے۔

Massive solar storm almost hit Earth in 2012

London: A massive magnetic storm with a speed of 3,000 km per second enough to circle Earth five times in one minute and the likes of which has not been seen in the past 150years almost hit the world in 2012. But as it tore through Earth's orbit, releasing energy equivalent to that of about a billion hydrogen bombs, good fortune prevailed on the Blue Planet, which was placed on the other side of the sun at the time. Had the eruption come nine days earlier, it would have hit Earth, potentially destroying our electrical grid, disabling satellites and GPS and disrupting our increasingly electronic lives, wreaking havoc and causing fireworks. Experts confirmed on Wednesday that a fierce solar eruption known as coronal mass ejections blasted away from the sun and sent a pulse of magnetized plasma barrelling into space and through Earth's orbit. (*The Times of India*, New Delhi, March 20, 2014, p. 19)

نقل وحرکت

کسی تحریک (movement) کی کامیابی کے لیے صرف آئڈیالوجی کافی نہیں۔ اس کے لیے ایسی چیز بھی ضروری ہے جو عملی مظاہرے کی حیثیت رکھتی ہو۔ اِس کی ایک صورت نقل وحرکت ہے۔ اِس نقل وحرکت کو قرآن میں سیاحت (9:112) کہا گیا ہے۔ قدیم یونان میں ایک گروپ تھا جس کو مشّائین (travellers) کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ مسلسل طور پر پیدل سفر کرتے تھے اور اِس طرح لوگوں کے درمیان اپنے افکار پھیلاتے تھے۔ حضرت مسیح کے بعد سینٹ پال نے اِس طریقے کو اختیار کرتے ہوئے مسیحیت کو مختلف ملکوں میں پھیلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو غزوات اور سرایا پیش آئے، وہ بھی ایک اعتبار سے اِسی زمرے میں آتے ہیں۔ مسلم صوفیا کا طریقہ بھی یہی تھا کہ وہ اپنے مریدوں کے ساتھ سفر کرتے تھے اور جگہ جگہ اپنا حلقہ (order) بناتے تھے۔ موجودہ زمانے میں تبلیغی جماعت نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور اسی بنا پر اس کو ''مسجد وار تحریک'' کہا جاتا ہے۔

الرسالہ مشن کی توسیع کے لیے بھی نقل وحرکت کے طریقے کو بڑے پیمانے پر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اب اللہ کے فضل سے ہر شہر اور ہر بستی میں قارئین الرسالہ کے حلقے بن چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ الرسالہ مشن کے لوگ سفر کرکے ہر جگہ پہنچیں، وہ ہر مقام پر قارئین الرسالہ سے ملیں، اُن کو متحرک کریں، ان کو منظم کریں، ہر جگہ ہفتے وار اجتماعات کا نظم کریں، ہر جگہ لائبریری قائم کریں، وغیرہ۔ جدید کمیونکیشن نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ اب نقل وحرکت کے کام کو مزید اضافے کے ساتھ کیا جائے، یعنی نہ صرف جسمانی نقل وحرکت، بلکہ الیکٹرانک نقل وحرکت بھی۔

موجودہ زمانے میں کمیونکیشن کی ترقی نے نقل وحرکت کے کام کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اِس امکان کو بھرپور طور پر استعمال کریں۔ نقل وحرکت کے بغیر اگر الرسالہ مشن حسابی رفتار (arithmetic progression) سے آگے بڑھ رہا ہے تو نقل وحرکت کے بعد وہ ہندسی رفتار (geometric progression) سے آگے بڑھنے لگے گا۔

دعوتی نقل وحرکت کا یہ کام ممبئی کے حلقہ الرسالہ نے عملاً شروع کر دیا ہے۔ وہ منظم انداز میں اِس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ وہ مہاراشٹریہ کے مختلف مقامات پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ جاتے ہیں۔ اِس دعوتی کام کے لیے وہ جدید ٹکنالوجی کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اُن کو اِس کام میں ہر جگہ لوگوں کا تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ اِس طرح اِس علاقے میں یہ دعوتی مشن تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اِس معاملے میں جو لوگ ممبئی والوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، وہ حسب ذیل ٹیلی فون پر اُن سے ربط قائم کر سکتے ہیں — محبوب بھائی: 09619163993

دعوتی نقل وحرکت کا یہی وہ کام ہے جس کو قرآن میں سیاحت کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن میں 'السائحون والسائحات' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت کا یہ کام اہلِ ایمان مردوں اور اہلِ ایمان عورتوں دونوں کو یکساں طور پر انجام دینا ہے۔ دونوں سے یہ مطلوب ہے کہ وہ دعوتی مشن کے کام میں دوسرے طریقوں کے علاوہ نقل وحرکت کے طریقوں کو استعمال کریں۔ وہ دعوت کے عمل کو ایک متحرک عمل بنا دیں۔

سیاحت کا مطلب ہے — سفر کرنا (to travel)۔ سفر ایک عام انسانی ضرورت ہے۔ سفر چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ سفر قریب کی منزل کے لیے بھی ہوتا ہے اور دور کی منزل کے لیے بھی۔ سفر کی نوعیت کا تعلق خود سفر سے نہیں ہے، بلکہ مسافر سے ہے۔ مسافر کا جو مقصد حیات ہو، اُسی سے اس کے سفر کا مقصد بھی متعین ہوتا ہے۔ مثلاً تاجر کا سفر تجارت کے لیے ہوتا ہے۔ سیاح کا سفر تفریح کے لیے ہوتا ہے، وغیرہ۔ مومن اپنے عقیدے کے اعتبار سے، ایک صاحبِ مشن انسان ہوتا ہے۔ مومن کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس نے جس سچائی کو دریافت کیا ہے، اس سچائی کو وہ تمام دنیا والوں تک پہنچائے۔ یہی وہ صفت ہے جو مومن کی سیاحت کو ایک دعوتی سیاحت بنا دیتی ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے، اس کا مشن بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ سفر کے ہر مرحلے میں اس کا دعوتی مشن جاری رہتا ہے۔ اِس معاملے میں عورت اور مرد کا کوئی فرق نہیں۔ مومن اور مومنہ دونوں ہمیشہ دعوتی توسیع کے اِس کام میں سرگرم رہتے ہیں۔ (14 اپریل 2014)

انسان، ٹکنالوجی

امریکا کے ایک سفر میں مجھ کو ایک سنٹر دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک روحانی مشن کا سنٹر تھا۔ اِس مشن کے بانی (founder) کا انتقال ہو چکا تھا۔ بانی جیسی کوئی زندہ شخصیت وہاں موجودہ نہ تھی۔ اِس کے باوجود سنٹر میں مشن کی تمام سرگرمیاں بدستور جاری تھیں۔ میں نے غور کیا تو بانی کی غیر موجودگی کے باوجود مشن کی سرگرمیوں کے بدستور جاری رہنے کا سبب دو چیزیں تھیں — ٹیم اور ٹکنالوجی۔

بانی کا انتقال ہوا تو اس نے اپنے بعد دو چیزیں چھوڑی تھیں: ڈیڈی کیٹڈ ٹیم (dedicated team) اور تحریر اور تقریر کی شکل میں اپنا پیغام۔ بانی نے اپنی سنجیدہ کوششوں کے ذریعے بہت سے افراد کو متاثر کیا، یہاں تک کہ اس کے مشن کی پشت پر ایک مضبوط ٹیم بن گئی۔

اِس کے علاوہ بانی نے بہت سی کتابیں لکھیں اور بڑی تعداد میں اس کی تقریروں سے آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ تیار ہو گئے۔ سنٹر میں میں نے دیکھا کہ اس کی ٹیم نہایت سنجیدہ انداز میں اِن چیزوں کو استعمال کر رہی ہے۔ اس نے وہاں لائبریری اور ریڈنگ روم بنایا۔ کتابوں کے ڈسٹری بیوشن کے لیے نظام قائم کیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ رات دن کے بڑے حصے میں مسلسل آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ چلتے تھے۔ اِس کے علاوہ نہایت منظم پیمانے پر اس کی ترسیل کی جارہی تھی، اُس کو جگہ جگہ ڈاک کے ذریعے بھیجا جا رہا تھا۔ اِسی طرح کمپیوٹر ٹکنالوجی کا استعمال بھی وہاں بھرپور طور پر کیا جا رہا تھا۔

انسان کے وجود کے دو پہلو ہیں — اس کی آواز اور اس کی جسمانی شخصیت۔ پچھلے زمانے میں انسان کی وفات کے بعد یہ دونوں چیزیں باقی نہیں رہتی تھیں۔ اب ٹکنالوجی نے یہ ممکن کر دیا ہے کہ انسان کی آواز اور اس کی شخصیت دونوں بظاہر اِس طرح باقی رہیں جیسے کہ وہ انسان اب بھی پوری طرح موجود ہے۔ موجودزمانے میں کسی مشن کے تسلسل کو قائم رکھنے کا یہ ایک نیا امکان ہے جو جدید ٹکنالوجی کے ذریعے پیدا ہوا ہے۔

حقیقت پسندانہ مزاج

نئی دہلی میں انڈیا گیٹ کا علاقہ بہت خاص علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت یہاں لوگ سیر وتفریح کے لیے آتے ہیں۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ ایک شخص وہاں آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور اس کا بچہ تھا۔ بچے نے اپنے باپ سے آئس کریم کی فرمائش کی۔ باپ نے فوراً اپنی جیب سے ایک نوٹ نکالا۔ اس نے آئس کریم کا ایک پیکٹ خریدا اور پھر تینوں کھڑے کھڑے آئس کریم کھانے لگے۔ میں نے اُس آدمی کے چہرے کو دیکھا تو اس کے چہرے پر فخر کی چمک تھی۔ گویا کہ خاموش انداز میں وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میری جیب میں پیسہ ہے اور میں اپنے پیسے سے آئس کریم خرید کر اپنے بچے کی فرمائش پوری کرسکتا ہوں۔ یہ پورا واقعہ اُس کے نزدیک ''میں'' کا کارنامہ تھا۔ اِس کے لیے اُسے کسی اور کا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

یہی تمام انسانوں کا حال ہے۔ تمام عورت اور مرد اِسی احساس میں جی رہے ہیں۔ اِس احساس نے لوگوں کے اندر سے تواضع (modesty) کا جذبہ چھین لیا ہے۔ ہر آدمی کا کیس کبر (arrogance) کا کیس بنا ہوا ہے۔ ہر عورت اور مرد کا صرف ایک مذہب ہے، اور وہ ایگوازم (egoism) ہے۔ اِس ایگو کلچر نے ہر ایک کو خود پسند اور سرکش اور متکبر بنا دیا ہے۔ لوگوں کا یہ مزاج صرف اُس وقت تک چھپا رہتا ہے، جب تک ان کی انا کو چھیڑا نہ جائے۔ اَنا کو چھیڑتے ہی ہر آدمی بتا دیتا ہے کہ وہ کبر کا کیس تھا، اگرچہ وہ بظاہر متواضع (modest) بنا ہوا تھا۔

یہ مزاج سرتاسر غیر حقیقت پسندانہ مزاج ہے۔ اگر آدمی حقیقتِ واقعہ پر غور کرے تو وہ کبھی بھی متکبر نہ بنے۔ کیوں کہ اِس دنیا میں کسی کے لیے متکبر بننا مضحکہ خیز حد تک بے معنیٰ ہے۔ چناں چہ کوئی سائنٹسٹ کبھی متکبر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اُس کا میدانِ مطالعہ علومِ قطعیہ (exact sciences) ہوتے ہیں۔ اِس بنا پر اس کے اندر اپنے آپ حقیقت پسندی کا مزاج آجاتا ہے۔

ہر سائنٹسٹ، شعوری یا غیر شعوری طور پر جانتا ہے کہ اس کو کامل طور پر حقیقتِ واقعہ کی پابندی

کرنا ہے۔ اگر وہ حقیقتِ واقعہ سے ذرا بھی ہٹے تو وہ مطلوب نتیجے تک پہنچنے سے محروم رہ جائے گا۔ گویا کہ اگزیکٹ سائنس، اس کے اندر اگزیکٹ تھنکنگ کا مزاج بناتی ہے۔ اور اگیزیکٹ تھنکنگ ہی کا دوسرا نام حقیقت پسندی ہے۔

اب انڈیا گیٹ کے مذکورہ واقعہ کو لیجیے۔ آدمی کے اندر فخر کا جذبہ کیوں آیا۔ صرف اس لیے کہ اس کے اندر سائنسی مزاج، بالفاظ دیگر، حقیقت پسندانہ مزاج موجود نہ تھا۔ اگر اس کے اندر صحیح مزاج موجود ہوتا تو آئس کریم کا پیکٹ اس کے تواضع میں اضافہ کرتا نہ کہ فخر اور گھمنڈ میں، جیسا کہ عملاً پیش آیا۔

آئس کریم کیا ہے۔ آئس کریم ایک عظیم تحفہ ہے۔ آئس کریم کو وجود میں لانے میں ایک طرف نیچر کا طویل کائناتی عمل شامل ہے، اور دوسری طرف انسان کی تہذیبی جدوجہد کا لمبا سفر اس کو وجود میں لانے میں سرگرم رہا ہے۔ اِس طرح ناقابلِ یقین حد تک ایک پُراز واقعات تاریخ کے نتیجے میں وہ وقت آیا کہ ایک شخص کو خوب صورت کیس میں پیک کی ہوئی آئس کریم حاصل ہو سکے۔

ایک سائنسی نظریے کے مطابق، تقریباً دس بلین سال پہلے وسیع کائنات گیسوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے بعد لمبے عمل کے نتیجے میں ہائڈروجن اور آکسیجن مخصوص تناسب میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے۔ اِس کے نتیجے میں پانی وجود میں آیا۔ اس کے بعد لمبی مدت تک زمین پر پانی برستا رہا۔ اس کے نتیجے میں زمین پر پانی کے ذخیرے اکھٹا ہو گیے۔ اس کے بعد حیوانات وجود میں آئے۔ آخر میں انسان اِس زمین پر آباد ہوا۔

اِس طرح لمبی مدت کے عمل کے نتیجے میں دودھ دینے والے جانور پیدا ہوئے۔ پھر انسانی تہذیب کا عمل شروع ہوا۔ انسانی تہذیب ہزاروں سال تک ایک ارتقائی سفر طے کرتی رہی۔ اس نے حیوانات سے دودھ حاصل کیا۔ پھر اِس دودھ کے مختلف مرکبات بنائے۔ پھر جدید صنعت ظہور میں آئی۔ اس کے بعد یہ ممکن ہوا کہ دودھ کو آئس کریم کی شکل میں ڈھالا جا سکے۔ اور اس کو خوب صورت

پیکٹ میں پیک کر کے بازار میں لایا جائے۔

عالمِ فطرت اور انسانی تہذیب دونوں کے اس لمبے مشترک عمل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج جب ایک آدمی چند روپیے دے کر بازار سے آئس کریم کا پیکٹ حاصل کرتا ہے تو اِس پورے عمل (process) کے مقابلے میں آدمی کا اپنا حصہ ایک فی بلین سے بھی بہت زیادہ کم ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے ہاتھ میں جب آئس کریم کا پیکٹ آئے تو وہ سرتاپا تواضع میں ڈھل جائے۔ دوطرفہ احسان مندی کے جذبے سے اُس کی گردن جھک جائے۔ فخر اور گھمنڈ کا کوئی ذرہ بھی اس کے دل میں باقی نہ رہے۔

یہ صرف آئس کریم کا معاملہ نہیں۔ اِس دنیا میں ہر چیز کا معاملہ یہی ہے۔ کوئی بھی چھوٹی یا بڑی چیز جس کو آدمی استعمال کرتا ہے، وہ اِسی طرح انسان کے لیے ایک عالمی عطیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک طرف فطری سپورٹ (natural support) اور دوسری طرف تہذیبی سپورٹ (civilizational support)، اِن دونوں قسم کے عظیم سپورٹ کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی مرد یا عورت اِس زمین پر آباد ہو اور اپنے لیے ایک کامیاب زندگی حاصل کر سکے۔

اِس واقعے کا اِدراک انسان کے لیے بے حد اہم ہے۔ اِسی ادراک کے نتیجے میں انسان کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا ہوتی ہے جس کو تواضع کہا جاتا ہے۔ یہی تواضع انسان کی اصل پہچان ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع نہیں، وہ گویا کہ انسان بھی نہیں۔

ضروری اعلان

تمام قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جولائی 2014 سے الرسالہ کی قیمت فی پرچہ -/20 روپے کر دی گئی ہے۔ اب ایک سال کے لئے زرِتعاون -/200 روپے، دوسال کے لئے -/400 روپے اور تین سال کے لئے -/600 روپے ہوگا۔

سب کچھ خدا کا عطیہ

عرب میں جب پٹرول کی دولت آئی تو وہاں اچانک زندگی کا نقشہ بدل گیا۔ ایک عرب شیخ پہلے معمولی خیمے میں رہتا تھا۔ اُس کی زندگی کا انحصار تمام تر اونٹ کے اوپر تھا، پھر اچانک اُس کے پاس پٹرول کی دولت آ گئی۔ اس کے ایک دوست نے اس کے لیے سویز رلینڈ میں جدید طرز کا ایک شان دار مکان خریدا۔ عرب شیخ ہوائی جہاز سے سفر کر کے وہاں پہنچا اور اپنے خوب صورت مکان کو دیکھا تو اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اُسی کا مکان ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔

وہ اپنے مکان کی دیوار اور اس کے فرنیچر کو ہاتھ سے چھو کر دیکھتا تھا کہ وہ سچ مچ اپنے مکان میں ہے، یا وہ خواب میں کوئی تصوراتی محل دیکھ رہا ہے۔ بہت دیر کے بعد جب اس کو یقین ہوا کہ یہ ایک حقیقی مکان ہے اور وہ اُسی کا اپنا مکان ہے تو وہ خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ سجدے میں گر پڑا اور دیر تک اِسی حالت میں پڑا رہا۔

یہ کیفیت جو ایک عرب شیخ کے اوپر گزری، یہی کیفیت ہر انسان کے اوپر بہت زیادہ بڑے پیمانے پر گزرنا چاہیے۔ اس لیے کہ موجودہ دنیا کی صورت میں ہر انسان کو وہی چیز ملی ہوئی ہے، جو عرب شیخ کو سویز رلینڈ کے مکان کی صورت میں ملی۔ سویز رلینڈ کا مکان عرب شیخ کے لیے جتنا عجیب تھا، اس سے بے شمار گنا زیادہ عجیب موجودہ کائنات ہے جو کوئی قیمت ادا کیے بغیر ہر اِنسان کو ہر لمحہ ملی ہوئی ہے۔ ہر انسان کا کیس مزید اضافے کے ساتھ وہی ہے جو مذکورہ عرب شیخ کا کیس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان، کامل طور پر عاجز اور محروم انسان ہے۔ پھر اس کو موجودہ دنیا کی صورت میں سب کچھ دے دیا جاتا ہے۔ فطرت اپنے تمام خزانوں کے ساتھ تاحیات اس کی خدمت گزار بن جاتی ہے۔

انسان کا پیدا ہونا ایک حیرت ناک عجوبہ ہے۔ انسان اگر اپنے بارے میں سوچے تو وہ ایک ایک چیز پر دہشت زدہ ہو کر رہ جائے گا۔ ایک ایسا انسان جو زندگی رکھتا ہے، جس کے اندر دیکھنے اور سننے کی صلاحیت ہے، جو سوچتا ہے اور چلتا ہے، جو منصوبہ بناتا ہے اور اس کو اپنے حسب منشا عمل میں لاتا ہے۔

یہ سب اتنی زیادہ انوکھی صفات ہیں جو انسان کو اپنے آپ بلا قیمت ملی ہوئی ہیں۔ انسان اگر اِس پر سوچے تو وہ شکر کے احساس میں ڈوب جائے۔

پھر یہ دنیا جس کے اندر انسان رہتا ہے، وہ حیرت ناک حد تک ایک موافقِ انسان دنیا ہے۔ زمین جیسا کُرہ ساری وسیع کائنات میں کوئی دوسرا نہیں۔ یہاں پانی ہے، یہاں سبزہ ہے، یہاں ہوا ہے، یہاں دھوپ ہے، یہاں کھانے کا سامان ہے اور دوسری اَن گنت چیزیں خالق کے یک طرفہ عطیے کے طور پر موجود ہیں۔ یہ چیزیں زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

اگر آدمی اِس حقیقت کو سوچے تو وہ مذکورہ عرب شیخ کی طرح شکر کے احساس سے سجدے میں گر پڑے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان دنیا کی چیزوں کو فار گرانٹیڈ (for granted) طور پر لیے رہتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے، اُس کو ہونا ہی چاہیے۔ جو کچھ اُس کو ملا ہوا ہے، وہ اُس کو ملنا ہی چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا امتحان ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں اپنے شعور کو زندہ کرے۔ وہ بار بار سوچ کر اِس حقیقت کو سمجھے کہ وہ سرتا پا ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کو جو کچھ ملا ہوا ہے، وہ مکمل طور پر خدا کے دینے سے ملا ہے۔ خدا اگر نہ دے تو اُس کو کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ جو چیزیں انسان کو بظاہر اپنے آپ مل رہی ہیں، اُن کو وہ اِس طرح لے، جیسے کہ وہ ہر وقت براہِ راست خدا کی طرف سے بھیجی جا رہی ہیں۔ وہ ملی ہوئی چیزوں کو دی ہوئی چیزوں کے طور پر دریافت کرے۔

خدا کا مطلوب انسان وہ ہے جو اپنے ذہن کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ وہ بظاہر اسباب کے تحت ملنے والے سامانِ حیات کو بلا اسباب خدا کی طرف سے ملا ہوا سمجھے، وہ معمول (usual) کو خلافِ معمول (unusual) کے طور پر دیکھ سکے، وہ غیب کو شُہود کے درجے میں دریافت کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت میں خدا کا دیدار نصیب ہوگا اور یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے پڑوس میں بنائی جانے والی ابدی جنت میں جگہ پائیں گے۔

قرآن کا پیغام

قرآن کی سورہ مریم میں قرآن کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ (19:97) یعنی قرآن اِس لیے اتارا گیا ہے کہ وہ اہلِ تقویٰ کے لیے بشارت ثابت ہو۔ 'بشارت' کا مطلب اچھی خبر (good news) ہے۔ قرآن، خدا کی ایک مستند کتاب ہے۔ قرآن تمام انسانوں کو ایک اچھی خبر دینے والا ہے۔ وہ اچھی خبر یہ ہے کہ انسان اگر دنیا کی محدود زندگی میں حسنِ عمل کا طریقہ اختیار کرے تو وہ موت کے بعد کی زندگی میں ابدی جنت میں جگہ پائے گا۔

قرآن کے مطابق، یہ اچھی خبر اُن افراد کے لیے ہے جو دنیا کی زندگی میں تقوی کی روش اختیار کریں۔ جنت عمومی طور پر ہر انسان کو نہیں ملے گی، وہ صرف اُس انسان کو ملے گی جو دنیا کی زندگی میں تقوی کا ثبوت دے (3:133)۔ جنت ایک معیاری دنیا ہے۔ اِس معیاری دنیا میں جگہ پانے کی شرط صرف ایک ہے، اور وہ تقوی ہے۔ قرآن کے مطابق، یہی وہ منصوبۂ تخلیق (creation plan) ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کرکے اس کو محدود مدت کے لیے سیارۂ ارض (planet earth) پر بسایا گیا ہے۔ سیارۂ ارض انسان کے لیے کوئی عیش گاہ نہیں ہے، وہ مذکورہ مقصد کے لیے مقامِ انتخاب (selection ground) ہے۔ یہاں وہ افراد چُنے جا رہے ہیں جو اپنی اعلیٰ صفات کی بنا پر جنت جیسی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ یہی بات قرآن کی سورہ الملک میں اِن الفاظ میں کہی گئی ہے: الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2) یعنی اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے:

He created death and life so that He might test you, and find out which of you is best in conduct.

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، وہ وسیع تر تقسیم (division) میں دو ہیں — مادی دنیا اور انسان۔ مادی دنیا سے مراد وہ پوری وسیع کائنات ہے جس کو نیچر (nature) کہا جاتا ہے۔ مادی دنیا

مکمل طور پر خدا کے مقرر کئے ہوئے قانون (divine laws) کے تحت کام کر رہی ہے۔ وہ خدا کے قانون سے ادنی انحراف نہیں کرتی۔ مگر انسان کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ انسان پوری کائنات میں ایک استثنا کی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ انسان کو انتخاب کی آزادی (freedom of choice) عطا کی گئی ہے۔ انسان کو کامل اختیار حاصل ہے کہ وہ خود اپنی سوچ کے مطابق، اپنے قول وعمل کا فیصلہ کرے۔ یہ بات قرآن کی مختلف آیتوں میں بتائی گئی ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالاں کہ اُسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے، اور سب اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے'' (3: 83)۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک اور آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو چاہے گا، تو وہ دین اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ناکام انسانوں میں سے ہوگا'' (3: 85)

قرآن کی اِس آیت میں لفظ 'اسلام' (submission) استعمال کیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کی جو اطاعت بقیہ کائنات سے جبری (compulsory) طور پر مطلوب ہے، انسان سے یہ مطلوب ہے کہ اِسی اطاعت کو وہ کامل آزادی کے ساتھ اپنی زندگی میں اختیار کرے۔

قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق، جنت کی بشارت متقی انسانوں کے لیے ہے۔ متقی کا لفظی مطلب ہے — ڈرنے والا یا بچنے والا۔ ڈرنا یا بچنا کیا ہے، یہ دراصل حساسیت (sensitivity) کا ایک ظاہرہ ہے۔ جب آدمی کسی چیز کے بارے میں بہت زیادہ باشعور ہو جائے تو فطری طور پر وہ اس کے بارے میں بہت زیادہ حساس (sensitive) ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی میں سب سے بڑا رول اِسی حساسیت کا ہے۔ آدمی جس چیز کے بارے میں حساس نہ ہو، وہ اس کو نظر انداز کرے گا، اور جس چیز کے بارے میں وہ حساس ہو، وہ چیز اس کا کنسرن (concern) بن جائے گی۔ عین اپنے مزاج کے مطابق، اُس کو وہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز سمجھنے لگے گا۔

قرآن کا پیغام یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ڈسٹریکشن سے بچائے۔ وہ اپنے شعور کو اتنا زیادہ بیدار کرے کہ اپنی زندگی میں خدا کی اطاعت ہی اُس کا سب سے بڑا کنسرن (sole concern)

بن جائے، کوئی دوسری چیز اس کی حساسیت کا مرکز نہ بنے۔

قرآن کی اِس آیت میں دراصل اُس چیز کا حکم دیا گیا ہے جس کو ایک لفظ میں صحیح طرزِ فکر کہا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی درستگی کا سارا مدار اِس پر ہے کہ اس کے اندر صحیح طرز فکر پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے قول اور عمل کے معاملے میں اپنے آپ کو پوری طرح قانونِ خداوندی کے مطابق بنالے۔

ایسے آدمی کا حال کیا ہوگا، اُس کو قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (17: 36) یعنی تم اُس چیز کے پیرو نہ بنو جس کا تمھیں علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی، آدمی سے پوچھ ہوگی۔

قرآن کی اِس آیت میں دراصل اُس چیز کا حکم دیا گیا ہے جس کو ایک لفظ میں صحیح طرزِ فکر کہا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی درستگی کا سارا مدار اِس پر ہے کہ اس کے اندر صحیح طرز فکر پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے قول اور عمل کے معاملے میں اپنے آپ کو پوری طرح قانونِ خداوندی کے مطابق بنالے۔

انسان کو سننے کی طاقت، دیکھنے کی طاقت اور سوچنے کی طاقت اِس لیے دی گئی ہے، تاکہ انسان اُن کا استعمال کرکے اپنے لیے اُس صحیح روش کو جان سکے جس کو قرآن میں صراطِ مستقیم کہا گیا ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹنا، اِس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے اپنی ملی ہوئی صلاحیتوں کو درست طور پر استعمال نہیں کیا۔ ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ مواخذہ (accountable) قرار پائے گا، کوئی بھی عذر اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا (57 :30)۔ اِسی طرح حیاتِ انسانی کا ایک اصول یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کبر (arrogance) کی نفسیات سے بچائے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (31: 18) یعنی تم زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن کی اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے لیے سب سے بُری اخلاقی صفت کیا ہے، وہ کبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کبر تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کے برعکس، تواضع (modesty) تمام بھلائیوں کا

سرچشمہ۔ قرآن کا مطلوب انسان وہ ہے جو متواضع ہو اور کبر کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی ہو۔

قرآن کی سورہ الفجر میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے ساتھ جو خوش گوار یا ناخوش گوار تجربات پیش آتے ہیں، وہ صرف ابتلا (test) کے لیے ہوتے ہیں، مگر انسان ایسے واقعات کو منفی معنی میں لے لیتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ خوش گوار واقعہ پیش آئے تو وہ 'أکرمن' کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے، یعنی احساسِ برتری (superiority complex) کی نفسیات میں۔ اِس کے برعکس، اگر اُس کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آئے تو وہ 'أھانن' کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے، یعنی احساسِ کم تری (inferiority complex) کی نفسیات میں (89:15-16)۔

قرآن کے مطابق، یہ دونوں چیزیں انسان کو ہلاک کرنے والی ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ انسان کے ساتھ کوئی خوش گوار واقعہ پیش آئے، تب بھی وہ اعتدال کی حالت پر قائم رہے۔ اور اگر اس کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آئے، تب بھی وہ اعتدال کی حالت پر قائم رہے۔ جو انسان اِس طرح معتدل شخصیت کا ثبوت دے، اس کو قرآن میں النفس المطمئنة (89:27) کہا گیا ہے، یعنی کامپلکس فری انسان (complex-free soul)۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کسی انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُس کو موت کے بعد کی ابدی زندگی میں جنت میں داخلہ مل جائے۔ اِس سلسلے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (37:60-61) یعنی یقیناً یہی بڑی کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے مطابق، انسان کا گول (goal) کیا ہونا چاہئے، وہ گول صرف ایک ہے، اور وہ جنت ہے۔ جنت سادہ طور پر صرف ایک عیش گاہ نہیں ہے۔ جنت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رب العالمین کا پڑوس ہے، اور بلاشبہہ کسی انسان کے لیے اِس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی کہ اس کو ابدی زندگی میں اپنے رب کا پڑوس (neighbourhood) حاصل ہو جائے۔ جنت کی یہ خصوصیت قرآن کی اِس دعا سے معلوم ہوتی ہے: رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (66:11) یعنی اے میرے رب، میرے لیے تو اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے۔

کائنات کا سائنسی مطالعہ

کائنات کے سائنسی مطالعے کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مشہور عالم نے لکھا ہے— کائنات کے اسرار کی جستجو اور رموزِ فطرت کی عقدہ کشائی کا ذوق ایمان کے دروازے کی کلید ہے۔لیکن جس جستجو کا مطلوب خدا نہ ہو اور جو عقدہ کشائی ایمان بالآخرت کی طرف رہبری کرنے والی نہ ہو، قرآن کے نزدیک یہ جستجو ہرزہ گردی اور یہ عقیدہ کشائی بادپیمائی ہے۔

موجودہ سائنس کا موضوع کائنات (nature) کا مطالعہ ہے۔مگر سائنس کا مقصد نہ فلسفیانہ مطالعہ ہے اور نہ مذہبی مطالعہ۔فلسفیانہ مطالعہ اور مذہبی مطالعہ دونوں، علمی اصطلاح کے مطابق، سبجیکٹیو مطالعہ (subjective study) کے طریقے ہیں۔اس کے برعکس، سائنس کا طریقِ مطالعہ وہ ہے جس کو آبجیکٹیو مطالعہ (objective study) کہا جاتا ہے، یعنی کائنات کے صرف اُس پہلو کا مطالعہ جو تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں آتا ہو۔

سائنسی تحقیق کی حیثیت کسی مذہبی کتاب جیسی نہیں ہے۔اپنے موضوعِ مطالعہ کے اعتبار سے، سائنس کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ڈیٹا (data) فراہم کردے۔یہ ہمارا کام ہے کہ ہم سائنس کے فراہم کردہ ڈیٹا کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔میں نے سائنس کا مطالعہ اِسی نقطہ نظر کے تحت کیا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ اقتباس اِس معاملے میں صورتِ حال کی صحیح نمائندگی نہیں ہے۔ اِس معاملے میں زیادہ درست طور پر کہنے کی بات یہ ہے کہ — کائنات خدا کی تخلیق ہے۔کائنات کا مطالعہ براہِ راست طور پر تخلیق کی دریافت ہے اور بالواسطہ طور پر خدا کی دریافت۔

سائنس کو صرف سائنس کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے۔سائنس نے گہرے مطالعے کے ذریعے فطرت کے بارے میں قابلِ قدر ڈیٹا (valuable data) فراہم کردئے ہیں۔یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اِس ڈیٹا کو استعمال کرکے اسلام کا نیا علمِ کلام مرتب کریں۔یہ ہمارے اپنے عمل کا معاملہ ہے، نہ کہ سائنس کے طریقِ مطالعہ کا معاملہ۔

مسلم تاریخ کا احیا

1799 میں مسلم دنیا میں دو بڑے بڑے واقعات ہوئے۔ایک طرف، اِسی سال میسور (انڈیا) کے سلطان ٹیپو، انگریز فوج سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔اس کے بعد انگریزی فوج کے جنرل نے خوش ہوکر کہا تھا:

Today, India is ours.

دوسری طرف، اِسی سال (1799) بحرِ روم (Mediteranean Sea) میں واقع عثمانی ترکوں کے طاقت ور بحری بیڑہ (naval fleet) پر یورپی قوموں نے حملہ کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔اِس کے بعد یورپی فوج کے جنرل نے خوش ہوکر کہا تھا:

This is the beginning of the end.

1799 مسلمانوں کے عروج کے خاتمے کی علامت ہے۔ دوسری طرف، یہی 1799 مسلمانوں کے زوال کے آغاز کی علامت ہے۔اِس کے بعد پوری مسلم دنیا میں احیاءِ ملت کے نام سے زبردست سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔مگر لمبی مدت کی غیر معمولی قربانیوں کے باوجود احیاءِ ملت کی یہ دوسو سالہ جدوجہد اپنے مطلوب نتیجے کے اعتبار سے، سرتاسر ناکام رہی۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز ہی درست نہ تھا۔اُس وقت اٹھنے والے مسلم رہنماؤں کے لیے جو فوری ریفرنس (immediate reference) تھا، وہ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ تھی۔ چناں چہ مسلم احیا کی تحریک عملاً مسلمانوں کے سیاسی غلبہ کے احیا کی تحریک بن گئی۔حالاں کہ احیا کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ مسلمان تاریخ سے گزر کر دورِ نبوت تک پہنچیں اور وہ سنتِ رسول کے احیا کو اپنا نشانہ بنائیں، نہ کہ مسلم تاریخ کے احیا کو۔

اِسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ اِس دور میں اٹھنے والی مسلم تحریکوں کا نشانہ فکر اسلامی کا احیا نہ رہا، بلکہ عملاً مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا احیا اُن کا نشانہ بن کر رہ گیا۔

مردوزن کی مساوات

مردوزن کی مساوات (gender equality) کا لفظ پہلی بار یورپ میں استعمال کیا گیا۔ ابتداءً اِس کا مطلب تھا عورت اور مرد دونوں کو ووٹ کا یکساں حق دینا۔ اس کے بعد یہ اصطلاح بہت مقبول ہوئی اور ہر اعتبار سے مردوزن کی مساوات کو بتانے کے لیے اس کو ایک معیاری اصطلاح کا درجہ حاصل ہوگیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مزید تحقیقات کے بعد مساواتِ مردوزن کا نظریہ تنقید کا شکار ہوگیا۔

اِس سلسلے میں رسرچ کے متعدد نتائج شائع ہو چکے ہیں۔ اِس سلسلے کی تازہ ترین تحقیق وہ ہے جو امریکا کی پنسلوینیا یونی ورسٹی میں ہوئی ہے اور وہ امریکا کے ایک جرنل (*Proceedings of the National Academy of Science*) کے شمارہ 3 دسمبر 2013 میں چھپی ہے۔ اِس رسرچ کا خلاصہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (4 دسمبر 2013) میں شائع ہوا ہے۔

اِس رسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان شدید فرق (stark difference) پایا جاتا ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ عورتوں کی ذہنی ساخت اور مردوں کی ذہنی ساخت میں فرق ہوتا ہے:

> Women's brains are designed for social skills and memory, while men's are for perception and coordination. (*The Times of India,* New Delhi, December 4, 2013, page 23)

عورت اور مرد کی فطری ساخت میں فرق ایک عظیم حکمت پر مبنی ہے، وہ یہ کہ دونوں زندگی کی گاڑی چلانے میں دو پہیے کا رول ادا کریں۔ دونوں اپنے اپنے اعتبار سے ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔ عورت اور مرد کے درمیان مساوات بہ اعتبار رتبہ ہے، نہ کہ بہ اعتبار رول:

Equal in status, but different in role.

تخلیقِ انسانی کا مقصد

ہر زمانے کے اہلِ فکر ہمیشہ یہ سوچتے رہے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا مقصد (purpose of creation) کیا ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق، تقریباً 5 ہزار سال سے انسان اِس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مگر اکیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک اِس کا کوئی متفق علیہ جواب انسان دریافت نہ کرسکا۔

مشہور برٹش سائنس داں سر جیمز جینز (وفات: 1946) نے اپنی کتاب پراسرار کائنات (*The Mysterious Universe*) میں لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اس کے لیے بنائی نہیں گئی تھی:

It seems that man has strayed in a world that was not made for him.

اِس موضوع پر سوچنے والے لوگوں نے عام طور پر مایوسی کی باتیں کی ہیں۔ ایک روسی مصنف نے لکھا ہے کہ اِس دنیا میں ہر چیز حسین (beautiful) ہے، صرف ایک چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔

ڈاکٹر الکسس کیرل نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اِس موضوع کی پیچیدگیوں کی بنا پر انھوں نے اِس کا نام انسانِ نامعلوم (*Man the Unknown*) رکھ دیا ہے۔ برطانی مصنف ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ جرائم کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ نے انسان کی ہستی پر غور کیا۔ اس نے کہا کہ میں سوچتا ہوں، اِس لیے میں ہوں (I think, therefore, I exist)۔ ڈیکارٹ کے اِس قول سے صرف انسان کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ انسان کے وجود کا مقصد (purpose of existence) کیا ہے۔

مشہور یونانی فلسفی ارسطو (وفات: 322 ق م) نے اِس مسئلے پر غور کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ — صرف قانونی نظام یہ کرسکتا ہے کہ وہ لوگوں کو اُن کے وحشیانہ سلوک سے بچائے:

The legal system alone saves people
from their own savagery.

ارسطو کو معلمِ اول کہا جاتا ہے۔ چناں چہ یہی سوچ بعد کی تاریخ میں رائج ہوگئی۔ ارسطو کی سوچ کا مطلب یہ تھا کہ انسان کو اعلیٰ اوصاف کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، لیکن یہ اوصاف ابتدائی طور پر بالقوہ حالت میں ہوتے ہیں۔ اِس بالقوہ کو بالفعل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک موافق سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) موجود ہو۔ اُس وقت کا یونانی بادشاہ سکندر اعظم (وفات: 323 ق م) ارسطو کا شاگرد تھا۔ ارسطو نے چاہا کہ بادشاہ کے تعاون سے وہ یونان میں مطلوب سیاسی اور سماجی نظام بنا سکے، مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ چناں چہ ارسطو مایوسی (despair) کی حالت میں صرف 62 سال کی عمر میں مرگیا۔

ارسطو کے نزدیک انسانی فلاح صرف صالح اجتماعی نظام کے ذریعے ممکن ہوسکتی تھی۔ ارسطو نے اپنے اس تصور کو فلسفہ کی زبان میں بیان کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس نے اپنے اِس تصور کو فلاسفائز (philosophise) کیا۔ اِس کے ایک عرصہ بعد جرمنی میں کارل مارکس (وفات: 1883) کا دور آیا۔ کارل مارکس نے اِس تصور کو اقتصادی اصطلاحوں میں بیان کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مارکس نے اِس تصور کو سیکولرائز (secularise) کیا۔ مگر کارل مارکس، عالمی کمیونسٹ پارٹی اور اِس تصور پر بننے والی سوویت ریاست (USSR) سب کی سب، اپنے اجتماعی نشانے کے حصول میں مکمل طور پر ناکام ہوگئے۔

اِس کے بعد یہ فکری منہج مسلمانوں کے درمیان رائج ہوا۔ عرب دنیا میں سید قطب (وفات: 1966) اور برصغیر ہند میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (وفات: 1979) پیدا ہوئے۔ اِن لوگوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس فکری منہج کو اسلام میں داخل کردیا۔ انھوں نے اسلام کی سیاسی تفسیر بیان کی۔ انھوں نے

اسلامی زندگی کے لیے اس کے مطابق، سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) کے قیام کو ضروری قرار دیا— ارسطو نے اِس تصور (concept) کا فلسفیانہ ایڈیشن تیار کیا تھا۔ کارل مارکس نے اِس تصور کا سیکولر ایڈیشن بنایا اور سید قطب اور سید ابو الاعلی مودودی نے اِس تصور کا اسلامی ایڈیشن تیار کر دیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلے ڈھائی ہزار سال کے دوران یہ نظریہ کبھی بھی واقعہ نہ بن سکا۔ کبھی کسی ملک میں ایسا نہیں ہوا کہ مصلح کے بیان کردہ نشانے کے مطابق، کوئی اجتماعی نظام یا کوئی سماجی نظام قائم ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اِس نظریے کے تمام علم بردار آخر کار مایوسی کی حالت میں مرے، وہ دنیا کو اپنے تصور کے مطابق، مطلوب نظام نہ دے سکے۔

اِس سے بھی زیادہ تلخ بات یہ ہے کہ اِس قسم کے تمام نام نہاد مصلحین کا انجام یہ ہوا کہ وہ تعمیر کے نام پر اٹھے اور دنیا کو عملاً تخریب کا تحفہ دے کر چلے گئے۔ ارسطو کے شاگرد سکندر اعظم نے ساری دنیا کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ کارل مارکس کے ماننے والوں نے اپنا مفروضہ نظام قائم کرنے کے نام پر روس میں 25 ملین انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ سید قطب اور سید ابو الاعلی مودودی کی تحریک کے نتیجے میں مختلف ملکوں میں اپنے مطلوب نظام کے قیام کے لیے مسلح جدوجہد (armed struggle) شروع ہوئی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

اجتماعی اصلاح کی اِن تحریکوں کا یہ منفی انجام کیوں ہوا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی نظام کا تعلق براہِ راست سیاسی اقتدار سے ہے۔ جب بھی آپ کسی ملک میں اپنی پسند کا اجتماعی نظام قائم کرنے کے لیے اٹھیں گے تو وہاں لازماً اُن لوگوں سے آپ کا ٹکراؤ پیش آئے گا جو بروقت سیاسی اقتدار پر قابض ہیں۔ اِس طرح اجتماعی نظام کا نظریہ اول دن سے ٹکراؤ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

سیاسی ٹکراؤ کوئی سادہ بات نہیں۔ سیاسی ٹکراؤ کا طریقہ عین اپنے نتیجے کے طور پر انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اسلام کے پولٹکل مفسرین کے الفاظ میں، ایک، ''طاغوت'' اور دوسرے، مخالفِ طاغوت۔ مخالفِ طاغوت گروہ اپنی تحریک کو پہلے قائم شدہ حکومت کے مقابلے میں اپوزیشن کے

طور پر شروع کرتا ہے۔ آغاز میں یہ کام بظاہر پُرامن طور پر شروع ہوتا ہے، لیکن جب پُرامن ذریعہ ناکام ہوجاتا ہے تو اس کے بعد دھیرے دھیرے قائم شدہ حکومت کے خلاف تشدد شروع ہوجاتا ہے، پھر جب تشدد سے بھی مطلوب کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو اس کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر خودکش بم باری شروع کردی جاتی ہے۔ اجتماعی انقلاب کا نتیجہ اپنے آخری انجام کو پہنچ کر صرف اجتماعی ہلاکت بن کر رہ جاتا ہے۔ اِس معاملے میں تباہ کن ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی انقلاب کا نظریہ اپنے آپ میں ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ وہ خالق کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس دنیا میں کوئی ایسا نظریہ کبھی مثبت نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا جو خالق کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہو۔

خالق کا نقشۂ تخلیق

خالق کا نقشۂ تخلیق (creation plan) کیا ہے۔ اس کو جاننے کا واحد مستند ذریعہ صرف قرآن ہے۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے انسان کو جس نقشے کے مطابق، پیدا کیا ہے، وہ کسی مفروضہ اجتماعی نظام پر مبنی نہیں ہے، وہ تمام تر انفرادی اصلاح کے تصور پر مبنی ہے۔ خالق نے دنیا میں اپنی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے ہر دور میں پیغمبر بھیجے۔ اِن تمام پیغمبروں کا نشانۂ دعوت ہمیشہ فرد (individual) ہوا کرتا تھا، نہ کہ کسی قسم کا سوشیو پولٹکل سسٹم (socio-political system) خالق کا اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، اصل کنسرن (concern) یہ نہیں ہے کہ دنیا میں اجتماعی سطح پر کوئی آئڈیل نظام بنایا جائے۔ خالق کا نشانہ فرد سازی ہے، مجتمع سازی نہیں، کیوں کہ تخلیقی نقشے کے مطابق، مجتمع سازی آئڈیل معنوں میں ممکن ہی نہیں۔ آئڈیل نظام یا آئڈیل سماج صرف جنت میں قائم ہوسکتا ہے۔ موجودہ دنیا کی حیثیت انتخابی میدان (selection ground) کی ہے۔ خالق کی منشا یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایسے اعلیٰ افراد چنے جائیں جو آخرت کی ابدی جنت میں بسائے جانے کے مستحق ہوں۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے قرآن کی سورہ البقرہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی متعلق آیتوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔

فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ''۔(2:30-31)

اللہ تعالی نے جب انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ زمین کو اِس آزاد مخلوق کے چارج میں دے دے، اُس وقت فرشتوں نے یہ شبہہ ظاہر کیا کہ آزادی پاکر انسان زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ فرشتوں کا یہ شبہہ بے بنیاد نہ تھا۔ خود قرآن کے بیان سے ثابت ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا۔ ساتویں صدی کے ربع اول میں جب قرآن اترا تو اللہ تعالی نے اس میں یہ آیت شامل فرمائی: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41) یعنی خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جب بطور واقعہ وہی ہوا جس کا شبہہ فرشتوں نے ظاہر کیا تھا، تو پھر اللہ نے اولادِ آدم کو کیوں پیدا کیا اور کیوں اُن کو زمین پر بسنے کا موقع دیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، آدم کی پیدائش سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول تک جب کہ قرآن نازل ہوا، ہر قوم اور ہر بستی میں مسلسل طور پر اللہ کی طرف سے نذیر (بتانے والے) آتے رہے، اس کے باوجود آدم کی بعد کی نسلوں میں پیدا ہونے والے لوگوں کی اکثریت مفسد ثابت ہوئی، حتی کہ پوری تاریخ فساد سے بھری ہوئی تاریخ بن گئی۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو کیوں پیدا کیا۔ اِس سوال کا جواب قرآن کی مذکورہ آیتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کی اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آدم کو اُن کی اولاد کے نام (أسماء) بتائے۔ یہاں علمِ اسماء سے مراد علمِ مسمَّیات ہے۔ یہاں اسم سے مراد افراد کے نام (names) نہیں، بلکہ یہاں اسم سے مراد مُسمّیٰ (named) ہے، یعنی نام سے موسوم افراد۔ دوسری بات یہ کہ اُس وقت آدم کے سامنے اللہ نے اُن کی اولاد کے جن لوگوں کو پیش کیا، وہ پوری ذریتِ آدم یا پورا مجموعۂ انسانی نہ تھا۔ کیوں کہ

اگر تمام پیدا ہونے والے انسان اُن کے سامنے پیش کیے جاتے تو فرشتوں کا شبہہ رفع نہیں ہوسکتا تھا، بلکہ اِس قسم کے مظاہرے سے فرشتوں کے شبہہ کی تصدیق ہوجاتی۔ کیوں کہ خود قرآن کی تصدیق کے مطابق، پیدا ہونے والے انسانوں کی عظیم اکثریت عملاً مفسد ثابت ہوئی۔

اِس پہلو پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالی نے اُس وقت پوری اولادِ آدم کو نہیں بلکہ صرف اولادِ آدم کے منتخب افراد کو پیش کیا تھا۔ یہ منتخب افراد وہی تھے جن کو قرآن میں دوسرے مقام پر نبی اور صدیق اور شہید اور صالح کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے (4:69)۔ یہ مظاہرہ اللہ تعالی نے صرف فرشتوں کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ بالواسطہ طور پر اُس کا مخاطب وہ انسان بھی تھے جو اللہ کے مقصد تخلیق کو سمجھنا چاہتے ہوں۔

اِس معاملے کی مزید وضاحت قرآن کی سورہ الملک کی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2)۔ اِس آیت سے اور قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق سے اللہ تعالی کا مقصود احسن العمل افراد ہیں، پورے مجموعۂ انسانی میں عدل اور فلاح کا نظام قائم کرنا منصوبہ الٰہی کا نشانہ نہیں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ خالق نے جس نقشے کے تحت انسان کو پیدا کیا، اس میں ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ کیوں کہ اِس منصوبۂ تخلیق کے مطابق، ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی تھی۔ ہر انسان کے لیے کامل معنوں میں آزادانہ انتخاب (freedom of choice) کا موقع کھلا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات تھی کہ لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کریں اور اِس طرح اکثر لوگ عملاً مفسد بن جائیں۔ اِس بنا پر اللہ تعالی نے ایک قابلِ عمل نشانے کا انتخاب کیا، یعنی اپنے منصوبہ تخلیق کو مبنی بر فرد کے اصول پر قائم کرنا، نہ کہ مبنی بر مجموعہ کے اصول پر۔

اللہ تعالی کے مقرر کردہ نقشہ تخلیق کے مطابق، اب جو ہو رہا ہے، وہ یہ کہ زمین پر کامل معنوں میں آزادی کا ماحول ہے۔ لوگ ایک کے بعد ایک پیدا ہو رہے ہیں۔ اُن میں سے کوئی فرد اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کوئی غلط استعمال۔ عین اُسی وقت ایک غیبی نظام کے تحت فرشتے ہر ایک کا پورا ریکارڈ

تیار کر رہے ہیں۔ یہ ریکارڈ قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیش ہوگا۔ اُس وقت جو ہوگا، اس کو قرآن میں پیشگی طور پر مختلف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے: فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (42:7) یعنی ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔

تخلیق کے اِس تصور کے مطابق، آخرت میں یہ ہوگا کہ پوری نسلِ انسانی سے صالح افراد چنے جائیں گے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے یہ ثبوت دیا تھا کہ آزادی کے باوجود انھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال نہیں کیا۔ آزادی کے باوجود وہ کامل معنوں میں با اصول زندگی کے پابند رہے، آزادی کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح بے راہ روی سے بچایا۔ اِس طرح انھوں نے ثابت کیا کہ وہ جنت کے آئڈیل معاشرے میں بسائے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آخرت میں پوری تاریخ بشری کے اِن منتخب افراد کو جنت کے معیاری معاشرے میں بسا دیا جائے گا، اور بقیہ لوگ جو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرنے میں ناکام رہے، اُن کو دوسرے انسانوں سے الگ کر کے کائناتی کوڑا خانہ (universal litterbin) میں ڈال دیا جائے گا، جس کا دوسرا نام جہنم ہے۔ (2013)

بھوپال میں ماہ نامہ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم فرمائیں:

Mr. Bilaluddin
Al-Quran Mission
48, Aamwali Masjid, Jahangirabad, Bhopal (M.P.)
Mob. 09755300295, 07556542231

سہارن پور (یوپی) میں مولانا وحید الدین خاں کی اردو، ہندی اور انگریزی کتابیں، قرآن مجید کے ترجمے، دعوتی لٹریچر اور ماہ نامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

Dr. M. Aslam Khan (Principal)
National Medical IGNOU Community College
38 Ayodhyapuram Mahipura Dehradun Road, Saharanpur, U.P.
www.nmicc.com, dr_aslm@rediff.com, +919997153735

دہشت گردی کا مسئلہ

دہشت گردی (terrorism) کیا ہے۔ دہشت گردی اور جنگ (war) کے درمیان بہت مشابہت ہے۔ اِس لیے دہشت گردی کی ایسی تعریف کرنا ضروری ہے جس میں دہشت گردی کو جنگ سے الگ کیا جا سکے۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ جنگ باقاعدہ طور پر قائم شدہ حکومت کی طرف سے کی جانے والی کارروائی کا نام ہے، اور دہشت گردی اُس مسلّح کارروائی کو کہا جاتا ہے جو غیر ریاستی افراد (non-state actors) کے ذریعے انجام دی گئی ہو۔ ریاست کی طرف سے کیا جانے والا تشدد اپنے حق کا غلط استعمال ہے، اور غیر ریاستی تنظیم کی طرف سے کیا جانے والا تشدد ایک ایسا کام ہے جس کا سرے سے ان کو حق ہی نہیں۔

اِس تعریف (definition) کے مطابق، دہشت گردی اسلام میں سراسر ناجائز ہے۔ کیوں کہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ: **الرحیل للإمام** (جنگ کا اعلان صرف حاکمِ وقت کا ایک خصوصی حق ہے)۔ غیر ریاستی افراد کو اگر کسی فرد یا کسی ادارے سے شکایت ہے تو اُن کے لیے صرف ایک ہی آپشن (option) ہے، یہ کہ وہ پُرامن انداز کے پابند رہتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کریں۔ غیر ریاستی افراد کو کسی بھی عذر (excuse) کی بنا پر مسلح کارروائی کی اجازت نہیں۔ غیر ریاستی افراد یا ادارہ اگر کسی معاملے میں مسلح کارروائی کا طریقہ اختیار کریں تو اِسی کا نام دہشت گردی ہے۔

غیر ریاستی افراد اگر اپنی مسلح کارروائی کو جہاد کا نام دیں تو جہاد کا نام دینے سے اُن کا عمل جہاد نہیں بن جائے گا، اِس کے باوجود وہ فساد قرار پائے گا۔ اللہ کی نظر میں ایسے لوگ مفسد قرار پائیں گے، نہ کہ مصلح۔ ایک قائم شدہ حکومت اسلام کے مطابق، نیز عالمی طور پر تسلیم شدہ اصول کے مطابق، جنگ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ لیکن یہ حق ایک لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے، وہ یہ کہ یہ جنگ صرف دفاع (defence) کے لیے ہونا چاہئے، یعنی اُس وقت جب کہ ایک ملک دوسرے ملک کے اوپر جارحیت کرے۔ اِس قسم کی جارحیت کے خلاف جنگ کرنا ہر حکومت کا حق ہے، بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ

جارح ملک نے بالقصد جارحانہ کارروائی کا معاملہ کیا ہے۔

اسلام کے مطابق، ظلم یا دشمنی کے حوالے سے ایک قائم شدہ حکومت بھی کسی کے خلاف جنگ نہیں چھیڑ سکتی۔ اگر کسی حکومت کو یہ شکایت ہو کہ اس کے خلاف کسی کی طرف سے دشمنی کا عمل کیا جارہا ہے، تب بھی اس کو پرامن حدود میں رہ کر اپنی جوابی تدبیر کرنا چاہیے۔ ظلم یا دشمنی کا حوالہ کسی حکومت کو یہ جواز فراہم نہیں کرتا کہ وہ اس کے خلاف مسلح کارروائی شروع کردے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41: 34) یعنی بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہیں۔ تم برائی کو اُس چیز سے دفع کرو جو زیادہ بہتر ہے، تو تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمنی اور دوستی دونوں اضافی الفاظ ہیں۔ خالق نے ہر انسان کو فطرتِ سلیم پر پیدا کیا ہے۔ بظاہر اگر کوئی شخص ظلم یا دشمنی کرتا ہوا نظر آئے تو اس کو بھی بالقوۃ دوست (potential friend) کے روپ میں دیکھنا چاہیے۔ اپنی طرف مثبت روش کے ذریعے یہ کوشش کرنا چاہیے کہ بالقوۃ دوست آپ کا بالفعل دوست (actual friend) بن جائے۔

قرآن کی ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: الصلح خير (4:128) یعنی مصالحت کا طریقہ بہترین طریقہ ہے۔ اِسی طرح حدیثِ رسول میں آیا ہے کہ: إن الله يعطي على الرفق، مالا يعطي على العُنف (صحيح مسلم، رقم الحديث: 2593) یعنی اللہ نرمی پر وہ دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔

'صلح' اور 'رفق' کو ایک لفظ میں امن (peace) کہہ سکتے ہیں۔ اسلام میں امن پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر حال میں امن کا طریقہ اختیار کرو، خواہ امن قائم کرنے کے لیے تم کو یک طرفہ صبر کا طریقہ اختیار کرنا پڑے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں صلح حدیبیہ اِسی قسم کی تدبیرِ امن کی ایک واضح مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام میں امن کو اتنی زیادہ اہمیت

کیوں دی گئی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام میں امن کی حیثیت سماجی اعتبار سے، خیرِ اعلیٰ (summom bonum) کی ہے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کام کو انجام دینے کے لیے امن کی ضرورت ہوتی ہے، حتی کہ پرامن حالات کے بغیر نماز اور روزہ جیسی چیزیں بھی حسن وخوبی کے ساتھ انجام نہیں دی جاسکتیں۔ دعوت اور اصلاح، اسلام کا اہم فریضہ ہے، مگر دعوت اور اصلاح کا کام موثر طور پر صرف اُس وقت انجام پاسکتا ہے، جب کہ حالات معتدل ہوں اور فریقین کے درمیان پُرامن فضا پائی جاتی ہو۔

اِس سے معلوم ہوا کہ قانونِ فطرت کے مطابق، جنگ سرے سے کوئی آپشن نہیں۔ جنگ کے ذریعے کوئی مثبت نتیجہ حاصل کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ پہلی عالمی جنگ (world war) اور دوسری عالمی جنگ، دونوں تاریخ کی عظیم ترین جنگیں تھیں، مگر دونوں جنگیں صرف عالمی تباہی پر ختم ہوئیں۔ اِن جنگوں سے کسی بھی فریق کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلح تصادم (armed conflict) ہر حال میں بربادی کا ذریعہ ہے۔ خواہ یہ مسلح تصادم ریاست کے ذریعے انجام پایا ہو یا کسی غیر ریاستی تنظیم (NGO) کے ذریعے۔

کشنج گنج (بہار) میں ماہ نامہ الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

CPG Messege Forum
At+P.O. Bahadurganj, Main Road,
Dist. Kishanganj. Pin-855101, Bhihar
Mob. 9470272115, 9430900563

صدر اسلامی مرکز کی دو نایاب کتابیں (نئے عہد کے دروازے پر، اسلام اور خدمتِ خلق) چھپ کر شائع ہوگئی ہیں۔ ملنے کا پتہ حسب ذیل ہے:

Rahbar Book Service
Printers, Publishers & Deistributors
Post Box No: 9736, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob. 09810862382, Email: rahbarbookservice@gmail.com

ردِّعمل کی سیاست

بیسویں صدی عیسوی میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے اندر ایسی تحریکیں اٹھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام کو قائم کیا جائے۔ عرب دنیا میں سید قطب (وفات: 1966)، برصغیر ہند میں سید ابوالاعلی مودودی (وفات: 1979) انڈونیشیا میں عبدالقہار مذکر (وفات: 1965)، سوڈان میں حسن تُرابی (پیدائش: 1932) اِس کی مثالیں ہیں۔ اِن لوگوں نے تقریر اور تحریر کے ذریعے مسلمانوں میں سیاسی احیا (political revival) کی کوشش کی۔

اِس قسم کی سیاسی تحریکیں، سب کی سب، ردِعمل (reaction) کی تحریکیں تھیں۔ وہ نوآبادیاتی دور (colonial age) کے خلاف ردِعمل کے طور پر پیدا ہوئیں۔ وہ اصلاً قومی سیاسی تحریکیں تھیں، لیکن اُن کو مسلمانوں کے درمیان اِس لیے مقبولیت حاصل ہوگئی، کیوں کہ اُن کے رہنماؤں نے انھیں اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کیا تھا۔

جس زمانے میں نوآبادیاتی طاقتوں کا ظہور ہوا، اُس زمانے میں دنیا کے بڑے حصے میں مسلم سلطنتیں قائم تھیں۔ برصغیر ہند میں مغل سلطنت، ترکی اور عرب ممالک میں عثمانی سلطنت، وغیرہ۔ اِسی طرح ایشیا اور افریقہ کے بیش تر علاقے، مسلم سلطنت کے تابع تھے۔ نوآبادیاتی طاقتیں جب مسلم دنیا میں داخل ہوئیں تو اُس وقت کی مسلم سلطنتوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن فوجی اور اقتصادی اعتبار سے نوآبادیاتی طاقتوں (colonial powers) کو برتری حاصل تھی، اِس لیے ہر میدان میں وہ غالب آتی چلی گئیں۔ یہ صورتِ حال، مسلم رہ نماؤں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، چناں چہ وہ ان کے خلاف لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ یہ جدوجہد ابتداءً غیر مسلّح انداز میں شروع ہوئی۔ مثلاً سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لٹریچر تیار کرکے اس کو پھیلانا شروع کر دیا۔ اِس لٹریچر میں اسلام کو اِس حیثیت سے پیش کیا گیا تھا کہ اسلام کے وجود و بقا کے لیے سیاسی غلبہ لازمی طور پر ضروری ہے۔ اِس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم دوبارہ اسلام کو سیاسی اعتبار سے غالب کرنے کی کوشش کریں۔

اِسی درمیان 1948 میں فلسطین میں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے بے حد ناقابلِ برداشت تھا۔ بال فور ڈکلریشن کے مطابق، یہودیوں کو محدود کوٹا سسٹم (limited quota system) کے تحت فلسطین کے ایک علاقے میں واپسی کی اجازت دی گئی۔ اصولاً یہ کوئی غلط فیصلہ نہ تھا۔ کیوں کہ یہ یہودی دراصل ڈائس پورا (diaspora) سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اور ڈائس پورا سے تعلق رکھنے والے یہودیوں کی فلسطین واپسی خود قرآن (5:21) کے مطابق، اصولاً درست تھی، لیکن مسلمان جو پہلے سے نوآبادیاتی مسئلے کی بنا پر مغربی قوموں سے برہم تھے، وہ مزید شدت کے ساتھ جنگ پر آمادہ ہو گئے۔

سیاسی جہاد کی یہ تحریکیں ابتداءً پُرامن انداز میں شروع کی گئیں، لیکن پرامن انداز جب پیشِ نظر مقصد کے لیے مفید ثابت نہیں ہوا، تو جہاد کے نام پر مسلّح تحریک شروع کر دی گئی۔ مگر رہنماؤں نے دوبارہ یہ دیکھا کہ مسلّح جہاد سے بھی وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں، تو اس کے بعد انھوں نے خودکش بم باری (suicide bombing) کا طریقہ اختیار کر لیا۔ خودکش بم باری بلاشبہہ اسلام میں حرام تھی، لیکن مسلم رہنماؤں نے اُسے استشہاد (طلب شہادت) کا نام دے کر اپنے لیے اس کو بطور خود جائز قرار دے دیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں جو صورتِ حال ہے، وہ یہ کہ مسلح جہاد اور خودکُش بم باری کے باوجود، مسلم رہنما اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلح جہاد عملاً کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوا ہے۔ اِس نام نہاد جہاد کے ذریعے مسلمان کچھ حاصل تو نہ کر سکے، البتہ جو کچھ انھیں حاصل تھا، اس کو بھی انھوں نے کھو دیا۔ اِس معاملے کو خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے، تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلم رہنماؤں کا ردعمل، خواہ وہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہو، یا اسرائیل کے خلاف، وہ اسلام سے انحراف کا نتیجہ تھا، نہ کہ اسلام کی پیروی کا نتیجہ۔ اِس معاملے میں مسلم رہنماؤں کی تحریکیں صحیح ڈائرکشن سے ہٹی ہوئی تھیں، وہ فطرت کے قانون کی خلاف ورزی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود اُنھیں اپنے مطلوب مقصد میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اِس معاملے کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے، تو قرآن میں ایک واضح آیت موجود ہے،

جو اِس معاملے میں رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن کی سورہ آل عمران میں اِسی قسم کی صورتِ حال کا حوالہ دیتے ہوئے، فطرت کا یہ اصول بتایا گیا تھا: تلک الأیام نداولها بین الناس (2:140) یعنی سیاسی اقتدار کسی ایک گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں، سیاسی اقتدار کبھی ایک گروہ کے پاس رہے گا اور کبھی دوسرے گروہ کے پاس۔ دوسرے لفظوں میں، یہ کہ جب سیاسی اقتدار میں تبدیلی ہو، تو اس کے خلاف ردعمل کرنا کوئی صحیح پالیسی نہیں۔

قرآن کی اِس تعلیم کا مقصد خود سپردگی اور پسپائی نہیں ہے، وہ دراصل ایک اعلیٰ حکمت ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ منفی ردعمل کے بجائے، مثبت منصوبہ بندی کے ذریعے صورتِ حال کا مقابلہ کیا جائے۔ جب بھی سیاسی اقتدار میں تبدیلی ہوتی ہے، تو وہ صرف تبدیلی کے ہم معنیٰ نہیں ہوتی، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ نئے مواقع کے ظہور کے ہم معنیٰ ہوتی ہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے، جو خدا نے قائم کیا ہے۔ جب بھی کوئی قوم دیر تک اقتدار کی حالت میں رہے، تو اس کے اندر جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیت (creativity) ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں سیاسی تبدیلی دراصل اِس لیے ہوتی ہے کہ اُس قوم کے جمود (stagnation) کو توڑا جائے۔ چیلنج کی صورت حال پیدا کر کے اُس کے اندر نئی بیداری لائی جائے۔ ہر گروہ لمبے اقتدار کے بعد ایک غیر تخلیقی گروہ (uncreative group) بن جاتا ہے۔ سیاسی اقتدار میں تبدیلی دراصل اِس لیے ہوتی ہے کہ اس کو دوبارہ ایک تخلیقی گروہ (creative group) بنایا جائے۔

مسلم رہنما اگر فطرت کے اِس قانون (law of nature) کو سمجھتے، تو ان کے لیے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کریں، بلکہ اُس کو وہ اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیں اور مثبت ذہن کے تحت، پُرامن طور پر وہ اس کا سامنا کریں، جیسا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان نے امریکا کے مقابلے میں کیا اور کامیابی حاصل کی۔ مگر مسلم رہنما اِس راز کو نہ سمجھ سکے۔ وہ منفی ردعمل کا شکار ہو گئے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس دنیا میں مثبت ردعمل کا نتیجہ مثبت صورت میں نکلتا ہے، اور منفی ردعمل کا نتیجہ منفی صورت میں۔ یہ فطرت کا ایک ابدی قانون ہے، اِس میں کسی بھی گروہ کا کوئی استثنا نہیں۔ (2009)

پیغمبرانہ ماڈل

انڈیا کی ایک مسلم تنظیم کے اجتماع میں ایک مشہور مسلم اسکالر کی تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد حاضرین میں سے ایک مسلمان نے پوچھا کہ انڈیا میں مسلمان اقلیت میں ہیں، غیر مسلم لوگ یہاں اکثریت میں ہیں۔ ایسی حالت میں، ہندستانی مسلمانوں کے لیے اسلام میں کیا رہنمائی دی گئی ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مقرر نے جواب دیا: یہ ایک مشکل سوال ہے۔ کیوں کہ اسلام میں پوزیشن آف اسٹرینتھ (position of strength) کا ماڈل موجود ہے، مگر اسلام میں پوزیشن آف ماڈسٹی (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں۔

یہ جواب بتاتا ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلم اسکالر اور مسلم رہنما اسلام کے نام سے صرف بعد کو بننے والی مسلم تاریخ کو جانتے ہیں، وہ دورِ اول میں بننے والے پیغمبرانہ ماڈل کو نہیں جانتے، حالاں کہ دورِ اول کا ماڈل تمام تر پوزیشن آف ماڈسٹی ہی پر مبنی ہے۔ یہ بعد کو قائم ہونے والے مسلم ایمپائر کی بات ہے، جب کہ وہ ماڈل بنا جس کو پوزیشن آف اسٹرینتھ کا ماڈل کہا جاتا ہے۔

دورِ اول میں اسلام کا ماڈل کیا ہے، وہ واضح طور پر قرآن میں موجود ہے۔ پیغمبر کو قرآن کی ابتدائی دور کی سورہ المدثر میں مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ (74: 1-3) یعنی اے پیغمبر، تم پرامن انداز میں دعوت الی اللہ کا فکری کام کرو اور پولٹکل سسٹم کے معاملے میں تم مکمل طور پر عدم تعرض کا طریقہ (non-confrontational method) اختیار کرو۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ اول کا پیغمبرانہ ماڈل دو بنیادی اصولوں پر مبنی تھا— دعوہ ایکٹوزم (dawah activism)، اور پولٹکل اسٹیٹس کوازم (political statusquoism)، یعنی پرامن ذرائع سے دعوت کا عمل کرنا اور سیاسی معاملات میں کامل طور پر عدم ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرنا۔ یہی پیغمبرانہ ماڈل اسلام کا اصل ماڈل ہے اور مسلمانوں کو اِسی پیغمبرانہ ماڈل کو اختیار کرنا ہے، مسلم اقلیت کے علاقے میں بھی، اور مسلم اکثریت کے علاقے میں بھی۔

شخصیت کی پہچان

امام مالک نے اپنی کتاب الموطا میں ایک باب کے تحت یہ روایت نقل کی ہے۔ باب کا عنوان ہے: باب ماجاء في التُّقى۔

قال مالك: وبلغني أن القاسم بن محمد كان يقول: أدركتُ الناس ما يعجبون بالقول- قال مالك: يريد بذلك العمل- إنما يُنظر إلى عمله، ولا ينظر إلى قوله-

یعنی مالک نے کہا کہ مجھ کو قاسم بن محمد تابعی کے بارے میں یہ بات پہنچی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے ایسے لوگ (صحابہ) پائے ہیں جن کا حال یہ تھا کہ وہ قول پر خوش یا متعجب نہیں ہوتے تھے۔ مالک نے کہا کہ اِس سے ان کی مراد عمل تھا۔ بے شک کسی انسان کا عمل دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا۔

اِس روایت میں ایک اہم حقیقت کو بتایا گیا ہے، وہ یہ کہ انسان کا قول اس کی پہچان نہیں ہے۔ کسی انسان کی حقیقی پہچان وہ ہے جو عملی تجربے کے بعد سامنے آئے۔ کسی شخص کے قول میں اس کی حقیقی شخصیت ظاہر نہیں ہوتی۔ لوگوں کا عام مزاج یہ ہے کہ وہ جب کسی بات کو کہتے ہیں تو وہ اس کو کہتے ہوئے اپنے موافق بات کو مبالغے کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور جو بات ان کے لیے غیر موافق ہے، اس کو وہ یا تو بیان نہیں کرتے یا گھٹا کر بیان کرتے ہیں۔ کسی بات کے ایک پہلو کو بڑھا کر بتانا اور اس کے دوسرے پہلو کو کم کر کے بتانا، یہ ایک ایسی عادت ہے جو تقریباً ہر انسان میں ہوتی ہے۔ اِسی عادت کے ذریعے وہ اپنی حقیقی شخصیت کو چھپائے رہتا ہے۔

کسی انسان کی حقیقی شخصیت صرف اُس وقت سامنے آتی ہے جب کہ وہ ٹسٹ (test) پر آجائے۔ آدمی قول میں اپنی شخصیت کو چھپا سکتا ہے، لیکن عملی تجربے میں اپنی حقیقی شخصیت کو چھپانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا — دانش مند وہ ہے جو کسی شخص کے بارے میں اس کے حقیقی عمل کو دیکھ کر رائے بنائے، نہ کہ اس کی خوش نما تحریر و تقریر کو سن کر۔

اپنی تاریخ سے کٹنا

مولانا شبلی نعمانی نے 1913 میں اعظم گڑھ (یوپی) میں دارالمصنفین کا ادارہ قائم کیا۔ اس کے چند دنوں کے بعد 18 نومبر 1914 کو 57 سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنے آخری دنوں میں اپنے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کو بلایا اور اُن کو دارالمصنفین کا پورا چارج دے دیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے پوری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ دارالمصنفین کا کام کیا اور دارالمصنفین کے بارے میں مولانا شبلی کے خواب کو واقعہ بنایا۔ بعد کو اپنے بعض ساتھیوں سے اُن کا اختلاف ہوا، یہاں تک کہ دل برداشتہ ہوکر 1946 میں انھوں نے دارالمصنفین کو چھوڑ دیا۔ وہ پہلے بھوپال اور پھر پاکستان چلے گئے۔ دارالمصنفین چھوڑنے کے 7 سال بعد 23 نومبر 1953 کو 69 سال کی عمر میں پاکستان (کراچی) میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ 7 سال جو مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین سے باہر گزارے، وہ بلاشبہہ ان کی زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی سال تھے۔ مگر یہ قیمتی سال اپنی تاریخ چھوڑنے کی وجہ سے ضائع ہوگئے، وہ حقیقی طور پر استعمال نہ ہوسکے۔

مولانا سید سلیمان ندوی جب دارالمصنفین کو چھوڑنے کا ارادہ کررہے تھے، اُس وقت دارالمصنفین میں اُن کے ایک ساتھی شاہ معین الدین احمد ندوی (وفات: 1974) موجود تھے۔ وہ اِس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ: ''سید صاحب مہینوں اس کے بارے میں کش مکش میں مبتلا رہے۔ راقم سے بھی انھوں نے رائے پوچھی۔ میں نے عرض کیا کہ کسی ادارے کے بانی کو اُسے چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کی یہ پہلی مثال ہوگی۔ فرمایا: یہ تو صحیح ہے، مگر دارالمصنفین میں سکون کے ساتھ رہنے کی شکل کیا ہے۔ اِس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا''۔ (حیاتِ سلیمان، از: شاہ معین الدین احمد ندوی، صفحہ 515)

شاہ معین الدین احمد ندوی نے دارالمصنفین نہ چھوڑنے کا جو مشورہ دیا، وہ بلاشبہہ اپنے آپ میں ایک درست مشورہ تھا، لیکن مشورہ دینے کا جو انداز تھا، وہ موثر نہیں ہوسکتا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین کے بانی (founder) نہیں تھے۔ مزید یہ کہ اِس مشورے میں یہ بات واضح نہ تھی کہ دارالمصنفین چھوڑنے کا نقصان کیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ایک فطری بات تھی کہ یہ مشورہ مولانا سید سلیمان ندوی کے مائنڈ کو ایڈریس نہ کرے اور وہ ان کے لیے قابلِ قبول نہ ہو سکے۔

اصل یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کا دارالمصنفین چھوڑنا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ خود اپنی بنائی ہوئی تاریخ کو چھوڑنے کے ہم معنی تھا، اور کوئی بھی شخص اپنی بنائی ہوئی تاریخ کو چھوڑنے کا تحمل نہیں کرسکتا۔ لوگوں کی نظر میں انسان کی حیثیت اس کی تاریخ سے متعین ہوتی ہے اور تاریخ ہمیشہ کسی ماحول میں بنتی ہے۔ جو آدمی اپنے ماحول کو چھوڑ دے، اس نے اپنی بنائی ہوئی تاریخ کو چھوڑ دیا۔ کوئی بھی دوسری چیز اِس غلطی کی تلافی نہیں کرسکتی۔

مولانا سید سلیمان ندوی 33 سال دارالمصنفین میں رہے۔ اِس 33 سال میں انھوں نے اپنی علمی تاریخ بنائی، لیکن اگر توسیعی اعتبار سے دیکھئے تو یہ مدت اور زیادہ لمبی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی وابستگانِ شبلی کی حیثیت سے 1907 میں نمایاں ہوئے۔ یہ وہ سال ہے جب کہ مولانا شبلی ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں تھے اور مولانا سید سلیمان ندوی ان کے شاگرد تھے۔ اُس وقت ندوہ میں ایک سالانہ جلسہ ہوا۔ اِس موقع پر مولانا سید سلیمان ندوی نے عربی میں ایک برجستہ تقریر کی۔ اِس تقریر سے مولانا شبلی نعمانی اتنا زیادہ خوش ہوئے کہ انھوں نے عین جلسہ گاہ میں اپنے سر کی پگڑی اتار کر مولانا سید سلیمان ندوی کے سر پر رکھ دی۔ (ملاحظہ ہو: حیاتِ سلیمان، صفحہ 28-27)۔

اِس اعتبار سے دیکھئے تو مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی تاریخ 1907 سے شروع ہوتی ہے۔ گویا کہ 1946 میں جب سید صاحب نے دارالمصنفین کو چھوڑا تو اُن کی علمی تاریخ کی مدت تقریباً 40 سال ہو چکی تھی۔ یہ چالیس سالہ تاریخ مولانا سید سلیمان ندوی کا سب سے بڑا سرمایہ تھی۔ وہ اگر دارالمصنفین میں رہتے تو وہ اپنی اِس 40 سالہ تاریخ کے درمیان رہتے۔ اُن کی ہر تقریر اور تحریر میں اِس 40 سالہ تاریخ کا وزن شامل رہتا، مگر انھوں نے اِس حقیقت کو نہیں سمجھا اور خود اپنی تاریخ سے اپنے آپ کو کاٹ لیا۔ اِس طرح یہ ہوا کہ اُن کے لیے جو رول مقدر

تھا، اُس کو ادا کیے بغیر وہ اِس دنیا سے چلے گئے۔

دارالمصنفین کو چھوڑنے کا جواز مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ بتایا تھا کہ دارالمصنفین میں سکون کے ساتھ رہنے کی شکل نہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے اِس جملے کی حیثیت عذر کی نہیں، بلکہ بے خبری کی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگار تھے۔ یہ بلاشبہہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام نے اُس سے بہت زیادہ بے سکونی کے حالات میں کام کیا جو مولانا سید سلیمان ندوی کو دارالمصنفین میں پیش آئے۔ اِس کا اندازہ پیغمبر اسلام کی اہلیہ حضرت عائشہ کے اِس قول سے ہوتا ہے کہ: حطمه الناس (صحيح مسلم، رقم الحديث: 1215) یعنی لوگوں نے آپ کو روند ڈالا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے پیغمبر اسلام کی سیرت لکھی، مگر اِس معاملے میں انھوں نے پیغمبر اسلام کی زندگی سے سبق حاصل نہیں کیا۔ اگر وہ سبق حاصل کرتے تو وہ کبھی ایسی غلطی نہ کرتے کہ بے سکونی کو اپنے لیے عذر بنا لیتے، حالاں کہ بے سکونی سرے سے کوئی عذر ہی نہیں۔ اِس دنیا میں بے سکونی کو مینیج (manage) کرنا ہے، نہ کہ اُس کو عذر بنانا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس: الصحة والفراغ (صحيح البخاري، رقم الحديث: 5962)

کوئی ادارہ اپنے آپ میں مقدس نہیں ہوتا۔ کسی ادارے کو چھوڑنا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لیکن ادارے کو چھوڑنے کی دو صورتیں ہیں — ایک ہے ذاتی شکایت (personal grievance) کی بنا پر چھوڑنا، اور دوسرا ہے اصول (principle) کی بنا پر چھوڑنا۔ ذاتی شکایت کی بنا پر ادارے کا چھوڑنا ہرگز درست نہیں، کیوں کہ ذاتی شکایت حقیقتاً فطرت کے نظام کا حصہ ہے، نہ کہ کسی کے ناروا سلوک کا حصہ۔ البتہ اصول کی بنا پر کسی ادارے کو چھوڑنا بلاشبہہ جائز ہے، کیوں کہ اصول کا تعلق دینِ حق سے ہوتا ہے، نہ کہ کسی کی اپنی ذات سے۔

انتخابِ اول، انتخابِ ثانی

ذاتی زندگی کا معاملہ ہو تو ایک شخص معیار (ideal) کا انتخاب کرسکتا ہے، لیکن اجتماعی زندگی کے معاملے میں کبھی معیار کا انتخاب ممکن نہیں ہوتا۔ اِس لیے اجتماعی زندگی کے بارے میں صحیح اصول یہ ہے کہ جب انتخابِ اول (first choice) ممکن نہ ہو تو انتخابِ ثانی (second choice) کو اختیار کرلیا جائے۔

اِس اصول کی حکمت یہ ہے کہ انتخابِ اول کو اختیار کرنے کی صورت میں اگر معیار حاصل ہوتا تھا، تو انتخابِ ثانی کی صورت میں امن اور استحکام (stability) حاصل ہوجاتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے یہی واحد عملی طریقہ ہے، اِس کے سوا کوئی اور طریقہ عملاً ممکن ہی نہیں۔

یہی فطری اصول پیغمبر کی سنت بھی ہے۔ مثلاً ہجرتِ مدینہ کے وقت فرسٹ چوائس یہ تھا کہ مکہ میں تیرہ سال کی جدوجہد سے جو جزئی کامیابی ہوئی تھی، وہ مزید جدوجہد کے ذریعے مکمل کامیابی تک پہنچے۔ اور سکنڈ چوائس یہ تھا کہ مکہ چھوڑ دیا جائے، تاکہ ٹکراؤ سے بچ کر پُرامن ماحول میں اپنا مشن جاری رکھا جائے۔ اُس وقت پیغمبر نے اپنے لیے سکنڈ چوائس کو اختیار کرلیا۔ اِسی طرح حدیبیہ کے موقع پر فرسٹ چوائس یہ تھا کہ سفر کو جاری رکھتے ہوئے آپ مکہ پہنچیں اور عمرہ کریں۔ اور سکنڈ چوائس یہ تھا کہ وہ درمیان میں اپنے سفر کو ختم کرکے مدینہ واپس چلے جائیں۔ پیغمبر نے اُس وقت بھی سکنڈ چوائس کو لینے کا فیصلہ کیا۔

یہی فطرت کا اصول ہے اور یہی پیغمبر کی سنت بھی۔ اِس دنیا میں کسی بھی میدان میں کامیابی اِسی اصول کو اختیار کرکے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہی قدیم زمانے میں بھی ممکن تھا اور یہی موجودہ زمانے میں بھی ممکن ہے۔ فرسٹ چوائس ہمیشہ آدمی کی ذاتی خواہش کے مطابق ہوتا ہے، اِس لیے وہ ہمیشہ فرسٹ چوائس پر اصرار کرتا ہے، لیکن یہ طریقہ یقینی طور پر غیر عملی ہے۔ نتیجہ خیز طریقہ صرف یہ ہے کہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے آدمی سکنڈ چوائس پر راضی ہوجائے۔

ترقی کا زینہ

زندگی ہم وار راستے پر سفر کرنے کا نام نہیں۔ زندگی میں ہمیشہ وہ ناموافق صورتِ حال پیش آتی ہے جس کو بحران (crisis) کہا جاتا ہے۔ زندگی میں بحران سے بچنا ممکن نہیں۔ اِس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے کرائسس مینج مینٹ (crisis management) کے آرٹ کو جاننا۔ انسان کو عقل اِسی لیے دی گئی ہے کہ وہ اس آرٹ کو جانے اور اس کو استعمال کرے۔

زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو بحران کوئی برائی نہیں، بحران ہر آدمی کے لیے ایک مفید تجربہ ہے۔ ہر بحران آدمی کے لیے کامیابی کا نیا موقع کھولتا ہے۔ اِس معاملے میں صحیح فارمولا صرف ایک ہے— بحران کو ایک نئے موقع میں تبدیل کردو:

Turn the crisis into an opportunity.

انسان کو جو عقل دی گئی ہے، اس کے اندر بے پناہ امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ عام حالات میں یہ امکانات سوئے ہوئے رہتے ہیں، معتدل حالات میں یہ امکانات کبھی نہیں جاگتے۔ یہ فطرت کا نظام ہے کہ انسان کی زندگی میں بحران پیدا ہو، تاکہ اس کا ذہن جاگے، تاکہ اُس کی عقلی صلاحیتیں بیدار ہو کر زیادہ بڑے بڑے کام کر سکیں۔ زندگی ایک چیلنج ہے اور چیلنج کا مقابلہ کرنا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کے لیے ترقی کے دروازے کھولتا ہے۔

بحران ہمیشہ فطرت کے نظام کے تحت پیش آتا ہے۔ اِس لیے کسی مفروضہ دشمن کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنا ایک غیر متعلق بات ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب اس کی زندگی میں کوئی بحران پیش آئے تو وہ شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع نہ کرے، بلکہ وہ اپنی عقلی صلاحیتوں کو متحرک کرنے کی کوشش کرے۔ اِس کے بعد وہ دیکھے گا کہ بحران اس کے لیے ترقی کا نیا زینہ بن گیا ہے۔

یہ اصول فرد کے لیے بھی ہے اور قوم کے لیے بھی، ذاتی زندگی میں بھی کامیابی کا یہی راز ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی کامیابی کا یہی راز۔

فخر اور نفرت

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کے اندر ایک نفسیات مشترک طور موجود رہتی ہے — فخر اور نفرت۔ فخر کا جذبہ اپنے لیے، اور نفرت کا جذبہ دوسروں کے لیے۔ ہر آدمی اِنھیں دو احساسات کے درمیان جیتا ہے اور اِنھیں دو احساسات کے درمیان مرجاتا ہے۔

یہ دونوں جذبات اتنے قوی ہیں کہ فخر کا اگر صرف ایک ذرہ اسے مل جائے تو اس کو لے کر وہ اپنے فخر کا گنبد کھڑا کر دیتا ہے۔ اِس طرح اگر اُس کو نفرت کا ایک ذرہ مل جائے تو اُس کو لے کر وہ دوسروں کو نفرت کا موضوع بنالیتا ہے۔ یہ دونوں جذبے اتنا زیادہ عام ہیں کہ اُس کو انسان کا عالمی مزاج کہا جاسکتا ہے۔

اِس مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی اپنے بارے میں فخر کی نفسیات میں جیتا ہے، اور دوسرے کے بارے میں نفرت کی نفسیات میں۔ یہ دونوں جذبات دھیرے دھیرے انسان کے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ انسان کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ اُس کو اِس معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر صورتِ حال میں یہ چیزیں اپنے آپ اس کے اندر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ہر صورتِ حال اپنے آپ اُس کو اپنے لیے فخر کی غذا دینے والی بن جاتی ہے۔

اِس طرح ہر صورتِ حال اپنے آپ اُس کو دوسروں کے بارے میں نفرت کی غذا دیتی رہتی ہے۔ یہ دوطرفہ نفسیاتی عمل آدمی کے اندر اِس طرح مسلسل طور پر جاری رہتا ہے کہ اِس میں اس کی کنڈیشننگ ہوجاتی ہے۔

یہ برائی آدمی کے اندر سوچے بغیر اپنے آپ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب اُس کو ختم کرنا ہو تو آدمی کو سوچ کر اسے ختم کرنا ہوتا ہے۔ یہ اِس معاملے کا سب سے زیادہ نازک پہلو ہے۔ اِس معاملے میں کوئی شخص اپنی اصلاح اُسی وقت کرسکتا ہے، جب کہ وہ شعوری طور پر اس کو دریافت کرلے، وہ شعوری طور پر اپنے اوپر اصلاح کا عمل کرنے لگے۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1۔ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

	ہندستان کے لئے	بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 150	$20
دو سال	Rs. 300	$40
تین سال	Rs. 450	$60

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday-Friday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحادِ ملّت
احیاءِ اسلام
اسباقِ تاریخ
اسفارِ ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصرِ حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دورِ جدید کا خالق
اسلام دینِ فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
امنِ عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغِ جنت
پیغمبرِ اسلام
پیغمبرِ انقلاب
تذکیر القرآن (مکمل)

تاریخ دعوتِ حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدیدِ دین
تصویرِ ملت
تعارفِ اسلام
تعبیر کی غلطی
تعددِ ازواج
تعمیرِ انسانیت
تعمیرِ حیات
تعمیر کی طرف
تعمیرِ ملت
حدیثِ رسول
حقیقتِ حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیاتِ طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج
دعوتِ اسلام
دعوتِ حق
دینِ انسانیت
دینِ کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
دین و شریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983

ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہِ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
سیرتِ رسول
شتمِ رسول کا مسئلہ
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہورِ اسلام
عظمتِ اسلام
عظمتِ صحابہ
عظمتِ قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دورِ جدید

عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکرِ اسلامی
قال اللہ و قال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
کتابِ معرفت
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
مسائلِ اجتہاد
مضامین اسلام
مطالعۂ حدیث
مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
مطالعۂ سیرت
مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
مولانا مودودی، شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نارِ جہنم
نشری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

اظہارِ دین

دورِ حاضر کی نسبت سے اسلام کو سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب

از: مولانا وحید الدین خاں

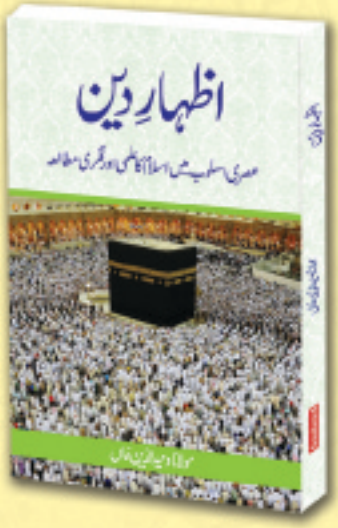

دورِ حاضر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، دورِ اسلام ہے۔ دورِ حاضر کی علمی ترقیوں نے اسلام کی عالمی اہمیت کو ازسرِ نو واضح کیا ہے۔ سائنس اسلام کا علمِ کلام ہے۔

دورِ جدید کو ایک آئڈیالوجی کی ضرورت ہے۔ اسلام اِسی آئڈیالوجی کا دوسرا نام ہے۔ روحِ عصر سب سے زیادہ جس چیز کی طالب ہے، وہ بلاشبہہ دینِ اسلام ہے۔ اسلام دنیا اور آخرت کی سعادتوں کے لیے ایک مستند گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام اپنے نظریے کے اعتبار سے، مبنی برتوحید دین ہے اور اپنے طریقِ کار کے اعتبار سے، مبنی برامن دین — عصری اسلوب میں اسلام کے اِن تمام پہلوؤں کو جاننے کے لیے 'اظہارِ دین' کا مطالعہ کیجئے۔

Pages: 720

Price: ₹ 200